قیمت: -/10 روپیے

جولائی 2005

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

گھٹا میں چھپ کے ستارے فنا نہیں ہوتے

سنیل دت

ولادت: 6/جون 1929 وفات: 25/مئی 2005

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

कौमी काउन्सिल बराए-फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Human Resource Development, (Deptt. of Secondary and Higher Education), Govt. of India
West Block-1, Wing No-6, R.K. Puram, New Delhi-110066.
Tel: 011-26103938, 26103381, 26179657 Fax: 011-26108159 E-mail: urducoun@ndf.vsnl.net.in

ایک سالہ ڈپلوما اِن کمپیوٹر ایپلی کیشنز اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. میں داخلے شروع

این.سی.پی.یو.ایل.
وزارت ترقی انسانی وسائل
حکومتِ ہند

فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ	: 9/جولائی 2005 (5 بجے شام تک)
انٹرویو	: 11-14/جولائی 2005
فائنل لسٹ ڈسپلے	: 16/جولائی 2005
کلاسیز کا آغاز	: 18/جولائی 2005 (پیر)

DOEACC
سینٹر، چنڈی گڑھ
وزارت آئی.ٹی، حکومتِ ہند

کورس : موڈیول-I: انفارمیشن ٹیکنالوجی، موڈیول-II: بزنس سسٹمس، موڈیول-III: ویب ایپلی کیشن ڈیولپمنٹ، موڈیول-IV: ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. اور اردو اسٹینوگرافی، موڈیول-V: پروجیکٹ ورک۔

اہلیت : منظور شدہ بورڈ سے انٹرمیڈیٹ (10+2) یا اس کے مساوی امتحان پاس کرنے والے طلبہ داخلے کے اہل ہوں گے۔

انٹرمیڈیٹ سے زیادہ اہلیت والے سائنس اور ریاضی کے طلبہ کو ترجیح دی جائے گی۔ فارم داخل کرتے وقت طالب علم کی عمر 17 سال سے زیادہ لیکن 35 سال سے کم ہونا لازمی ہے۔ طالب علموں کا داخلہ انٹرویو پر مبنی ہوگا جو سلیکشن کمیٹی کے ذریعے کیا جائے گا۔

فیس : داخلے کے بعد طالب علم کو =/250 روپے (صوبوں کی راجدھانیوں کے لیے =/500 روپے) ماہانہ فیس ادا کرنی ہوگی۔

قومی اردو کونسل نے انگریزی اور ہندی میڈیم میں فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے اردو کا ایک سالہ ڈپلوما کورس شروع کیا ہے۔ سبھی طلبہ کے لیے اس کورس میں داخلہ لینا لازمی ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔7، شمارہ۔7 جولائی 2005

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر، قومی اردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی-110006

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر کے پورم، نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381، 26103938
فیکس: 26179657، 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس،
بلاک نمبر 5، 1 پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2

ہماری بات .... اداریہ 5

● نیشن پال سے گفتگو .... مانش پریتم کوچین 6

● وزیر اعظم کی اعلیٰ علمی کمیٹی .... سید حامد 7

● بنیادی تدریسی مہارتیں .... ایل بی سنگھ 10

● کیرالا میں اردو .... کے پی شمس الدین 19

● کمپیوٹر اور خطاطی .... رحمت یوسف زئی 23

● اردو کی بقا کے لیے چند عملی تجاویز .... عارف اقبال 26

● اردو میں سائنسی صحافت .... اسعد فیصل فاروقی 28

● البرٹ آئن اسٹائن — دو صدیوں کا نقاش .... عبید الرحمان 29

● روبوٹ — ایک انسانی متبادل .... جگدیش سسودیہ 32

اتہاس کے جھروکے سے:

● ہندوستان میں اسلام کی آمد .... مدن گوپال 34

گوشۂ ادب:

● فسلیات .... کرشن چندر 38

● ایک نوحہ (نظم) .... راہی شہابی 40

● ڈی جے کاٹن — ایک تعارف .... حیات افتخار 43

گوشۂ فروغ کتب

● ٹیلی ویژن ("تاریخ ایجادات" سے اقتباس) .... ایکس ادارہ 45

● قومی نشانات (بھارت 2004 سے اقتباس) 50

طلبہ کے لیے

● چپس کے ساتھ لطف اندوزی .... امیت جین 52

● اردو ادب (کوئز) .... انو شمیم 56

● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-24) .... محمد انعام الحق 59

اردو خبرنامہ .... ادارہ 60

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 71

● پرواز / ڈاکٹر اے پی جے عبد الکلام .... مبصر: ظفر احمد نظامی

● مرزا غالب ایک سوانحی منظر نامہ / گلزار .... مبصر: قمر رئیس

● وائرس کا شکنجہ / ایرا سکسینہ .... مبصر: ایس اے رحمن

● موج نقد / مرزا احمد زماں آزردہ .... مبصر: کلیم اللہ

● کرناٹک میں اردو صحافت / انیس صدیقی .... مبصر: امجد جاوید

بچوں کا گوشہ

● بزدل شیر ("نورتن کہانیاں" سے اقتباس) .... شمیم احمد 76

آپ کی بات

■ راج بہادر گوڑ چیمبلی کا منڈوا، 1/99-8-1-1 سوریہ نگر، حیدرآباد

''اردو دنیا'' کے تازہ شمارے (مئی 2005) میں صفحہ 13 پر ''حیدرآباد اور اردو صحافت'' پر ایک مضمون ہے۔ مضمون بہت تشنہ ہے اور اس میں بہت سے اخبارات اور ان کے رول کا ذکر نہیں ہے۔ مثلاً حیدرآباد میں قاضی عبدالغفار کے اخبار ''پیام'' کا بہت اہم رول رہا ہے اس کا ذکر نہیں ہے۔ پھر ''مشیر دکن'' کا اپنا مقام ہے، مضمون میں اس کا بھی ذکر نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس موضوع پر ایک تفصیلی مضمون شائع کیا جائے جس میں حیدرآباد کے تمام اخبارات کا احاطہ کیا گیا ہو۔

■ لکھو محمد سنگھ (گورنر ہریانہ کے پی۔اے)، راج بھون، چنڈی گڑھ

عالی مرتبت ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام کی خودنوشت سوانح عمری ''پرواز'' کی ترسیل کے لیے میں عالی جناب ڈاکٹر اے۔ آر۔ قدوائی کے ایما پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

■ اقبال محی الدین، 46۔ نشاط اپارٹمنٹ، نزد شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

''اردو دنیا'' مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ بہت خوبصورت اور دلکش سر ورق کے عنوان نے میری توجہ الفاظ ''امتحان! امتحان! امتحان'' پر مبذول کردی۔ سر ورق کے نیچے لکھا تھا --- ''امتحان کا وقت آتے ہی بچے مسلسل بڑھتی مسابقت، والدین کے دباؤ اور سخت محنت کے باعث ہراساں ہوجاتے ہیں۔ امتحان کی وجہ سے طالب علموں کی بڑھتی خودکشی خطرے کی گھنٹی ہے۔ آخر اس کے اسباب کیا ہیں اور تعلیمی سطح پر کن اصلاحات کی ضرورت ہے؟''

رسالے کے صفحہ نمبر 6 پر مضمون ''امتحان کا خوف'' (تحریر: ابھیشیک راجا، ترجمہ: فیاض عالم) بہت غور سے پڑھا۔ مضمون بہت عمدہ ہے اور آج کے سلگتے موضوع پر مصنف نے قلم اٹھایا ہے۔ اس میں طالب علموں میں امتحان کے خوف اور ناکامی کے نتیجے میں بعض اوقات ان کی خودکشی کے رجحان پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون میں طلبہ کی امتحان میں ناکامی اور اس کے نتیجے میں خودکشی یا اقدام خودکشی پر ماہرین نفسیات کے خیالات کو معروضیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن تعلیمی سطح پر جن ضروری اصلاحات کی ضرورت ہے ان پہلوؤں کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔ وہ اصلاحات مندرجۂ ذیل ہوسکتی ہیں:

1. کھلی کتاب کے ساتھ امتحان

(Open Book Examination System)

امتحان کا یہ طریقہ رائج ہونے سے طلبہ میں امتحان کا خوف جاتا رہے گا اور ان پر ذہنی دباؤ بھی کم ہوجائے گا۔ نتیجتاً خودکشی کے واقعات بھی بہت کم ہوجائیں گے۔ اس طریقے میں طلبہ کو کتب خانے سے کتاب لے کر امتحان کے پرچوں کے مطابق متعلقہ کتابوں کو دیکھ کر سوالات کا جواب لکھنے کی آسانی ہوگی۔ مگر امتحانی پرچہ صرف تین گھنٹوں پر مشتمل ہوگا۔ اب طلبہ کی لیاقت، تیاری اور صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ اس متعینہ وقت میں تمام سوالات کا جواب بخوبی کیسے لکھ سکتے ہیں۔ اس طریقۂ امتحان میں طلبہ کو پہلے سے تیاری کی ضرورت ہے ورنہ وہ کتب خانے میں کتابیں اور سوالات کے جوابات ہی تلاش کرتے رہ جائیں گے اور وقت ختم ہوجائے گا۔ کھلی کتاب کے ساتھ امتحان کے طریقے کا ہندوستان اور بیرونی ممالک میں کئی تعلیمی بورڈوں نے تجربہ کیا ہے اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ اگر یہ نظام ہندوستان کے سارے امتحانی بورڈ اپنا لیں تو مسئلے کا حل بہ آسانی نکل سکتا ہے۔

2. مسلسل اور جامع جانچ

(Continuous Comprehensive Evaluation -CCE)

امتحانی اصلاحات کے سلسلے میں این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔، نئی دہلی نے یہ تجرباتی قدم اٹھایا اور اسکولوں میں سی سی ای کا نیا طریقہ شروع کرایا۔ اس طریقۂ تعلیم سے بچوں کی امتحانی تیاری پر خوشگوار اثر پڑا اور پورے کورس کے بوجھ کو کئی سمسٹروں میں تقسیم کردیا گیا اور ان کی جانچ اسی تعلیمی ادارے میں (Internal Evaluation) مستقل طور سے ہوتی رہی۔ نتیجے کے طور پر طلبہ کے اذہان پر امتحان کے سلسلے میں دباؤ بہت کم ہوگیا اور وہ کامیابی سے اپنے مقصد میں آگے بڑھتے رہے۔ یہ طریقۂ تعلیم بہت کامیاب ہے جس کی وجہ سے طلبہ خودکشی جیسے انتہائی خطرناک قدم اٹھانے سے بھی بچے رہے۔ اگر سی سی ای سارے تعلیمی نظام کا حصہ بن جائے تو طلبہ امتحان کے خوف سے محفوظ رہیں گے اور انھیں ناکامی کا منہ بھی نہیں دیکھنا پڑے گا۔

3. نفی امتحان

(No Examination Scheme)

طلبہ میں خودکشی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے مدنظر حکومت ہند کے محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل نے حال ہی میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ امتحان کے فرسودہ طریقے کو بالکل بدل دیا جائے اور طلبہ کا امتحان ہی نہ لیا جائے بلکہ اسکول میں ہی ان کی کارکردگی کی جانچ داخلی طور پر وقفے وقفے سے کی جائے اور ان کی تمام کارکردگی (Overall Performance) پر نظر رکھی جائے۔ اسی بنیاد پر اُن کو تعلیمی سال مکمل ہونے پر ترقی دے کر اگلے درجے میں

داخل کردیا جائے۔ اس طرح طلبہ وطالبات پر امتحان کا نفسیاتی اثر نہیں ہوگا اور وہ ناکامی کی صورت نہیں دیکھیں گے اور خودکشی جیسے خطرناک اقدام سے اپنے کو محفوظ رکھ سکیں گے۔ وزارت نے اپنی اس تجویز یعنی No Examination Scheme کو ہندوستان کے سارے امتحانی بورڈوں کے پاس اُن کے مشورے کے لیے بھیج دیا ہے جو اس تجویز پر غور وخوض اور بحث ومباحثے کے بعد وزارت کو اپنی رائے سے مطلع کریں گے۔

■ حبیب الرحمٰن چغتائی، حریم، مقابل جتاری ہاؤس، دودھپور،
سول لائنز، علی گڑھ

''اردو دنیا'' کا جون کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ سرورق پر تصویر میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے عبدالکلام کو ان کی خودنوشت سوانح ''ونگس آف فائر'' کے اردو ترجمے ''پرواز'' کے ساتھ دکھایا گیا ہے جو انھیں قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین نے پیش کیا۔ اطلاع کے مطابق ''اس کا Audio Version ممتاز ہدایت کار، شاعر اور افسانہ نگار جناب گلزار نے تیار کیا ہے۔'' یہ درست نہیں۔ تصویر میں دکھائی گئی کتاب سے گلزار صاحب کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہ راقم السطور کی کاوش کا نتیجہ ہے جو 201 صفحات پر مشتمل ہے۔ دراصل گلزار صاحب نے ''ونگس آف فائر'' کی بنیاد پر ایک سی۔ڈی۔ تیار کی ہے اور اس کا عنوان ''پرواز'' رکھا ہے۔ یہ سی۔ڈی۔ چھوٹی تقطیع پر چھپّن صفحات پر مشتمل کتابچے کے ساتھ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منظرِ عام پر آئی ہے جسے تصویر میں نہیں دکھایا گیا ہے۔ یہ ساری غلط فہمی تبدیلیِ عنوان سے پیدا ہوئی ہے۔ میں نے اپنے ترجمے کا عنوان ''پرواز آتش'' رکھا تھا جو ''تہذیب الاخلاق'' علی گڑھ میں سولہ قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اسے ناشر نے بدل کر محض ''پرواز'' کردیا ہے۔

قومی اردو کونسل کے بے حد معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ محولہ کتاب ''پرواز'' کی رسم پیش کش اتنی اچانک عمل میں آئی کہ مترجم کو اس کی اطلاع کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ عذر معقول تھا اس لیے کوئی شکوہ نہیں۔ مگر اس کو کیا کہا جائے گا؟ اس خبر میں مترجم کا نام تو بڑی آسانی سے بڑھایا جاسکتا تھا۔ اس میں تو بہرکیف ادارے کو دخل ہوا۔ اگر میں اسے اپنے ساتھ زیادتی کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس ترجمے نے میری یہ حالت کردی تھی کہ

انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

مگر واہ رے ستم ظریفی! مترجم کا نام پھر بھی اس خبر میں کوئی جگہ نہ پاسکا۔ اس خط کو لکھنے کا یہی محرک ہوا کہ کم از کم ''اردو دنیا'' کے قارئین تو صحیح صورت حال سے واقف ہوسکیں۔

صدر جمہوریۂ ہند عالی جناب اے۔پی۔جے۔ عبدالکلام کی آپ بیتی 'ونگس آف فائر' کا اردو ترجمہ جو حبیب الرحمٰن چغتائی صاحب نے کیا ہے اولاً 'تہذیب الاخلاق' علی گڑھ میں شائع ہوا تھا جسے کتابی شکل میں شائع کرنے کے حقوق اردو کونسل نے حاصل کرلیے تھے۔ گلزار صاحب کا تیارکردہ آڈیوورژن صدر محترم کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ان سے وقت لے لیا گیا تھا لیکن اس سے پہلے کتاب چھپ کر آگئی اس لیے یہ بھی ان کی خدمت میں پیش کردی گئی۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کے جون کے شمارے کے سرورق پر جو تصویر چھپی ہے وہ اسی موقعے کی ہے اور اس کے نیچے جو عبارت چھپی ہے، اس میں انھی حضرات کے اسمائے گرامی دیے گئے ہیں جو تصویر میں موجود ہیں — لیکن اسی شمارے میں خبرنامے کے تحت صفحہ 56پر 'ونگس آف فائر' کا اردو ترجمہ 'پرواز' صدر جمہوریہ کو پیش' کے عنوان سے جو پہلی خبر چھپی ہے اس میں چغتائی صاحب کا نام کتاب کے مترجم کی حیثیت سے درج ہے۔ پچھلے سرورق پر اس کتاب کا جواشتہار دوسری کتابوں کے اشتہار کے ساتھ دیا گیا ہے اس میں بھی مترجم کا نام نمایاں طور پر درج ہے۔ کتاب کے اردو ترجمے کا نام 'پرواز آتش' کی بجائے 'پرواز' کردینے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ گلزار صاحب کے تیارکردہ آڈیوورژن اور چغتائی صاحب کی ترجمہ کی ہوئی کتاب کے ناموں میں یکسانیت برقرار رہے۔ (ادارہ)

■ رام پرکاش کپور، ایل۔ بی۔ جی۔ 04، پی۔ ایچ۔ اے۔ ایلیزیم،
سیکٹر-28، گڑگاؤں-122002، ہریانہ

اپریل کے ''اردو دنیا'' میں مہمان اداریہ ''ترقی پسند تحریک'' نہایت اہم وفکر انگیز ہے لیکن مہمان مدیر کا یہ موقف کہ ''ترقی پسند تحریک اپنوں کی عدم توجہی اور غیروں کی نظریاتی مخالفت کی وجہ سے طویل مدت سے لاوارث لاش کی طرح سردخانے میں پڑی ہے'' کچھ زیادہ ہی مبالغہ آمیز لگتا ہے، ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ اس میں شک نہیں 1960 کے بعد ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے کی وہ پہلے جیسی چکاچوند کرنے والی روشنی کچھ ماند پڑگئی تھی۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ تحریک ''لاوارث لاش'' بن گئی تھی۔ اس کے بعد بھی اس تحریک سے وابستہ افراد ترقی پسند ادب تخلیق کرتے رہے۔ بلکہ یہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اس دوران بھی پورے خلوص اور جرأت کے ساتھ عوامی مسائل سے نبردآزما ہوئے۔ انھوں نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے بڑھ چڑھ کر قربانیاں بھی دیں۔ قید وبند کی اذیتیں بھی برداشت کیں۔ فیض جب تک زندہ رہے حقیقت پسند ادب کی

روایات کا پرچم بلند کیے رہے۔ برصغیر ہند و پاک میں متعدد ادیب و شاعر ترقی پسند تحریک کے اس نام نہاد ''زوال پذیر'' عہد میں بھی سرگرم رہے۔ پاکستان میں حسن ناصر سے لے کر فیض احمد فیض، حبیب جالب، حمید اختر، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، فارغ بخاری، سبط حسن وغیرہ نہ جانے کتنے ادیب اس آزمائش سے گزرے۔ ہندوستان میں بھی سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، ہنس راج رہبر اور دوسرے ادیبوں کے نام لیے جاسکتے ہیں اور آج بھی پروفیسر قمر رئیس اور متعدد دوسرے ادبا و شعرا ترقی پسند تحریک کا پرچم بلند رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

1980 کی دہائی میں جب ''بھائی لوگ'' ترقی پسند تحریک کا فاتحہ پڑھ چکے تھے وامق جونپوری نے صہبا لکھنوی کو اپنے ایک خط (3 ستمبر 1984) میں لکھا تھا: ''...... انجمن ترقی پسند مصنفین کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ (Death Certificate) پر دستخط کردینے سے یہ تحریک جو باشعور اذہان میں گھر کر چکی ہے، نہیں مرسکتی۔ وہ ادیب جو مردہ سمجھ لیے گئے تھے، انجمن کی تجہیز و تکفین کے بعد بھی اعلیٰ ترین ترقی پسند ادب تخلیق کرتے رہے۔'' اس سلسلے میں جناب وامق جونپوری کا ایک طویل مضمون بعنوان ''ترقی پسند تحریک کا مصنوعی بحران'' جولائی۔ اگست 1984 کے ''قومی آواز'' لکھنؤ میں قسط وار شائع ہوا تھا۔

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی واحد تحریک ہے جس کا باضابطہ مینی فیسٹو رہا ہے۔ جس نے اپنے آئینی ادب کے ذریعے زمینی مسائل اور سماجی سروکار سے اردو ادب کو نہ صرف متعارف کرایا بلکہ بہت حد تک مستفیض بھی کیا ہے۔ انھوں نے اردو ادب میں نسبتاً زیادہ طنطنہ و طمطراق کے ساتھ اپنی الگ تاریخ لکھی۔ انھوں نے عام لوگوں بالخصوص مزدوروں اور کسانوں کے مسائل حل کرنے کی کوششیں کیں۔ ہم کیسے مان لیں کہ یہ تحریک ''لاوارث لاش کی طرح سرد خانے میں پڑی ہے۔''

■ فاروق نازکی، 58 شیو پوسٹ۔ بی پی کینٹ، سری نگر، کشمیر

''اردو دنیا'' صوری اور معنوی اعتبار سے برصغیر کے تمام رسائل میں ایک منفرد مقام کا حامل بن گیا ہے۔ میں پوری باقاعدگی کے ساتھ اس رسالے سے کسب فیض کرتا رہا ہوں۔

ریاض پنجابی کا مضمون ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے، بہ دیگر الفاظ اس میں شامل مواد بہت کارآمد ہے۔ یہ تحریر خبر کے ساتھ ساتھ نظر بھی عطا کرتی ہے۔ سائنسی معلومات، اقتصادی معاملات کی تفسیر، لسانی و تدریسی مسائل اور دیگر ڈھیر سارے موضوعات ''اردو دنیا'' کے ذریعے قارئین کو فکر و نظر کی دولت سے مالا مال کردیتے ہیں اور رسالے کا یہی تنوع اس کی شناخت بن گیا ہے۔ ''شاعر'' اور ''شب خون'' کے ساتھ ساتھ یہ رسالہ بھی میری تنہائیوں کا ایک حیات افروز ساتھی ثابت ہو رہا ہے۔

■ امتیاز احمد مدوی، 457، جلی نگر، رائے بریلی، یوپی

قومی اردو کونسل گذشتہ کئی برسوں سے فروغ اردو کے میدان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ ہماری موجودہ حکومت بھی اردو کی ترویج و ترقی کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہے خصوصاً مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ تو اس سلسلے میں بہت ہی سنجیدہ ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ''اردو کو پھلنے پھولنے کا موقع ضرور ملے کیونکہ یہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان ہے'' اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔

ہم اپنی طرف سے اور اپنے ادارے صدیق اکبر ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، رائے بریلی کی جانب سے کونسل کی تشکیل نو نیز جناب شمس الرحمن فاروقی جیسے عظیم محقق و ناقد کو وائس چیئرمین بنانے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں کونسل نمایاں ترقی کرے گی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے اردو، عربی ڈپلوما کورسوں کا آغاز ملک کے مختلف حصوں میں کیا گیا ہے جس میں داخلہ لینے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے علاوہ ازیں اردو کمپیوٹر کے میدان میں بھی کونسل نے قابل لحاظ پیش رفت کی ہے۔

■ رئیس احمد اعظمی، رئیس ہومیو کلینک، مبارکپور، اعظم گڑھ (یوپی)

''اردو دنیا'' خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے۔ مئی کے شمارے میں ''ہماری بات'' میں جس اہم موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے اس کی اشد ضرورت تھی۔ آپ نے موجودہ نظام تعلیم، امتحان اور ان کے نقائص نیز لائحۂ عمل پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ ''گیسٹ کالم'' میں اتھیشیک راجا کا مضمون ''امتحان کا خوف'' بھی بہت خوب ہے، یہ آپ کی فکر کا آئینہ دار ہے۔ یہ مضمون تمام والدین کو پڑھنا چاہیے۔ دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں کی صورت حال پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ ان لوگوں پر افسوس نہیں بلکہ دکھ ہوتا ہے جو اپنا فرض نہیں ادا کرتے۔ اظہار اثر کا مضمون ''زبان اور تحریر کا سفر'' بہت اثر انگیز ہے، تفہیم کے لیے ہیرو غلیفی کے چارٹ نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا ہے، طلبہ کے لیے سیٹلائٹ بھی قابل مطالعہ مضمون ہے۔ سلام بن رزاق کا افسانہ ''چادر'' معنی خیز ہے اور موصوف سے کی گئی گفتگو بھی معلوماتی ہے۔

■ خالدہ افروز، علامہ اقبال لائبریری، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' پابندی سے مل رہا ہے۔ یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کو سائنس اینڈ کائنات سوسائٹی آف انڈیا کی طرف سے ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ایوارڈ دیا گیا۔ آپ واقعی اس اعزاز کے حقدار ہیں۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ فروغ اردو کے لیے آپ کی لگن اور محنت قابل داد ہے۔

ہماری بات

سنیل دت نہیں رہے۔ 25رمئی 2005 کو ایک ایسا شخص ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا جس کی رحم دلی، شرافت، خوش اخلاقی اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ مثالی تھا۔ سیکولرزم، قومی یکجہتی اور امن کا پیغام انھوں نے ملک کے کونے کونے میں پہنچایا اور اپنے ہموطنوں کو ایک مضبوط اور عظیم بھارت کی تعمیر کے لیے مل جل کر کام کرنے کی تلقین کی۔

سنیل دت ایک کامیاب اداکار ہی نہیں، باشعور سیاست داں اور ایک اچھے انسان بھی تھے۔ لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونا اور حتی الامکان ان کی مدد کرنا ان کے خمیر میں شامل تھا۔ انھوں نے شمال مغربی ممبئی سے پانچ بار لوک سبھا کا انتخاب لڑا اور انھیں ایک بار بھی شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انھوں نے کبھی کسی سرکاری عہدے کی خواہش نہیں کی بلکہ خاموشی سے خدمتِ خلق کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی سیکولرزم کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی۔ سنیل دت نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ''سیکولرزم کا میرا تصور ایک اچھا انسان ہونا ہے جو تمام مذاہب کا احترام کرتا ہو۔'' وہ تمام عمر گاندھی جی کے نظریۂ عدم تشدد پر عمل پیرا رہے۔

سنیل دت کی موت پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے وزیر اعظم جناب منموہن سنگھ نے بجا فرمایا کہ وہ ایک متنوع اور کرشماتی شخصیت کے مالک تھے جنھوں نے نہ صرف فلموں میں اپنی اداکاری سے کروڑوں لوگوں کا دل جیتا بلکہ وہ ہمارے ملک کی عظیم روایات و اقدار کے پاسدار بھی تھے۔ وہ تمام عمر سیکولرزم، آزادی اور مساوات کے حامی اور ان اقدار کے استحکام کے لیے معروفِ عمل رہے۔ 1962 کی ہندچین جنگ میں انھوں نے ایک بڑی رقم چندے میں دی اور اپنی بیوی نرگس اور دیگر فنکاروں کی جماعت لے کر محاذ جنگ پر بھی گئے اور ہندوستانی جوانوں کی حوصلہ افزائی کی۔

سنیل دت کی سماجی فلاح و بہبود کے کاموں سے کتنی گہری وابستگی تھی اس کا اندازہ حال ہی کے ایک واقعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ 22رمئی 2005 کے روزنامہ ''انڈین ایکسپریس'' میں ایک خبر چھپی تھی کہ نائب صدر جمہوریہ جناب بھیروں سنگھ شیخاوت نے دہلی میں کام کرنے والے غازی پور (یوپی) کے ایک مزدور کی بیوہ کے لیے ایک لاکھ روپے اور پانچ ساڑیاں بھیجی ہیں۔ اس مزدور کی ایک ٹرک حادثے میں موت ہوگئی تھی لیکن مرنے سے قبل اس نے اپنے اعضا کا عطیہ دے کر چھ لوگوں کی جان بچائی تھی۔ اس خبر سے متاثر ہو کر سنیل دت نے نائب صدر کو اپنی طرف سے بھی اس مزدور کی بیوہ کے لیے پچیس ہزار روپے کا چیک بھیجا۔

پنجاب میں جب دہشت گردی عروج پر تھی تو انھوں نے اپنی بیٹی پریا اور دیگر 80 لوگوں کے ساتھ ممبئی سے امرتسر تک دو ہزار کلومیٹر کا پیدل سفر کیا، گولڈن ٹیمپل میں بحالی امن کی دعا مانگی اور مصالحانہ مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ 1992 میں جب ممبئی میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکی تو سنیل دت سڑکوں پر نکل آئے اور مسلم محلوں میں جا جا کر فساد زدگان کی نہ صرف دلجوئی کی بلکہ ان کو یہ ڈھارس بھی بندھائی کہ ان پر کوئی آنچ نہ آئے گی اور وہ پوری طرح محفوظ رہیں گے۔

سنیل دت کی پیدائش غیر منقسم ہندوستان کے صوبے پنجاب میں 6رجون 1929 کو ضلع جہلم کے خورد گاؤں میں ہوئی تھی۔ ان کا اصل نام بلراج دت تھا لیکن جب انھوں نے فلمی دنیا میں قدم رکھا تو وہاں پہلے سے ایک اور بلراج یعنی بلراج ساہنی موجود تھے اس لیے انھوں نے اپنا نام سنیل دت رکھ لیا۔ وہ جب پانچ سال کے تھے تو ان کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا اور تیئس سال کی عمر میں وہ شفقت پدری سے محروم ہوگئے تھے۔ سنیل دت نے ممبئی کے جے ہند کالج سے بی۔اے۔ کیا اور کچھ ہی دنوں بعد انھیں ریڈیو سیلون میں اناؤنسر کی ملازمت مل گئی۔ ریڈیو سیلون کے پروگرام پیش کرتے ہوئے فلمی شخصیات سے ان کا تعارف ہوا اور ڈائرکٹر رمیش سہگل نے 1955 میں انھیں پہلی بار فلم ''ریلوے پلیٹ فارم'' میں پیش کیا۔

3رمئی 1981 کو ان کی بیوی نرگس کی کینسر سے موت ہوگئی۔ یہ ان کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے خود کو سنبھالا اور کینسر کے مریضوں کی مدد کے لیے ایک فعّال تنظیم بنائی۔ کینسر اور ایڈس جیسے موذی امراض کے شکار لوگوں کی وہ حتی الامکان مدد کرتے تھے۔ انھوں نے کینسر کے موضوع پر فلم ''درد کا رشتہ'' بنائی۔ یہ فلم بہت مقبول ہوئی اور اس سے ہونے والی ساری آمدنی سنیل دت نے ممبئی کے ٹاٹا میموریل اسپتال کو کینسر کے علاج اور اس پر تحقیق کے لیے وقف کر دی۔

سنیل دت کی قومی خدمات کے صلے میں انھیں مختلف اعزازات عطا کیے گئے جن میں پدم شری (1968) مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ برائے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی (1997) خان عبدالغفار خاں ایوارڈ برائے امن عالم، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی (1997) اور راجیو گاندھی قومی سدبھاؤنا ایوارڈ (1998) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

انھیں 22رمئی 2004 کو متحدہ ترقی پسند محاذ حکومت میں نوجوانوں کے امور اور کھیل کود کا وزیر بنایا گیا۔ اس ذمّے داری کو بھی انھوں نے بڑے سلیقے سے نبھایا اور ملک کے نوجوان کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی میں بھی کوئی کسر باقی نہ رکھی۔

آج دنیا کو ایسے ہی اچھے انسانوں کی ضرورت ہے جو امن و آشتی کی فضا کو ہموار کرسکیں۔

تحریر: مائش پرتیم گوہین
ترجمہ: مشرف علی

یشپال سے گفتگو

سوال: آپ کا تعلق نیشنل چلڈرنس سائنس کانگریس سے رہا ہے۔ بچے آپ سے کس طرح کے سوالات کرتے ہیں؟

جواب: بچوں کے مشاہدے پر مبنی سوالات نہایت دلچسپ ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک تجسس اور مزید جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ ایک بہترین عمل وہ ہے جب بچے سوچنا شروع کرتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں، یہی وہ طریقہ ہے جس سے علمی ماحول وجود میں آتا ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں سائنس تحریک آگے نہیں بڑھ رہی ہے؟

جواب: این.سی.ای.آر.ٹی. کے نصاب پر نظرِ ثانی کی گفتگو کے دوران بہت سے ماہرین نے کہا کہ تعلیمی نظام کے ایک حصے کے طور پر ہمارے پاس نیشنل چلڈرنس سائنس کانگریس کی طرح کا ہی ایک نظام ہونا چاہیے تاکہ بچے ماحول اور اپنے گردوپیش کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ وہ واقفیت سے بھرپور اور کارآمد اعداد و شمار جمع کرسکتے ہیں جسے دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں اسے تعلیم کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے جہاں زمینی سطح سے وابستہ افراد مسائل سے قریب اور ہم آہنگ ہوتے ہیں، مسائل سے موافقت پیدا کرتے ہیں اور تب ہم اس کے متعلق کچھ کرسکتے ہیں۔

سوال: آپ تدریسی و آموزشی عمل سے 1960کی دہائی میں وابستہ ہوئے۔ کیا آپ ان تجربات و مشاہدات پر روشنی ڈالیں گے جو اس طویل مدت میں آپ کو حاصل ہوئے؟

جواب: میرا تجربہ یہ ہے کہ محض سرکاری احکامات کی وجہ سے چیزیں وجود میں نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامینٹل ریسرچ (TIFR) کے انیل سدگوپال 66-1965 میں مدھیہ پردیش کے ایک گاؤں میں گئے اور وہاں پر دیہی بچوں کے لیے ایک اسکول شروع کیا۔ آموزشی عمل جسے انیل نے متعارف کرایا وہ روایتی تعلیم سے مختلف اور نہایت دلچسپ تھا۔ ٹی.آئی.ایف.آر. میں سے بہت سارے لوگ انیل کے خیالات سے مسرور تھے۔

میں نے ایک پبلک اسکول کے ساتھ کام کرنا شروع کیا اور پھر ممبئی میونسپل اسکولوں میں کام کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہر جگہ ہمیں نصاب میں تھوڑی بہت تبدیلی کرنی ہوگی۔ انیل نے بہت سارے دوسرے کام کیے اور یہ اکلویہ (Ekalavya) کی شکل میں سامنے آیا جو کہ ایک اہم تحریک ہے جس کے تحت ہزاروں اسکول آموزش کے نئے طریقوں پر کام کررہے ہیں۔ لیکن مسئلہ اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب آپ ان کے آموزشی طریقے کا موازنہ امتحان کے طور طریقے سے کرنے لگتے ہیں۔

سوال: تعلیم کو مصنوعی سیارچے کے ذریعے متعارف کرانے میں آپ کا کلیدی کردار ہے جو کہ بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ آپ کا کیا ردِّ عمل ہے؟

جواب: میں نے یہ تجربہ کیا تاکہ کوشش کروں اور یہ دیکھوں کہ کیا لوگوں کو سیارچے کے ذریعے تعلیم یافتہ بنایا جاسکتا ہے۔ میں نے سیکھا کہ اس کام کے لیے یگانگت اور عالم گیریت دونوں کو اکٹھا کرنا ضروری ہے، اس لیے ہم نے اس کے لیے ایک ماڈل تیار کیا جس میں یگانگت اور عالم گیریت کے نقطۂ اتصال کے لیے چھوٹے ٹرانسمیٹر سیارچے سے وابستہ تھے۔ اس طرح کی کوششوں کو سماج میں زندہ رکھنا نہایت ضروری ہے۔

سوال: عصر حاضر میں ریاضی اور تعلیمی بوجھ کو کم کرنے کے لیے جو بحث چل رہی ہے۔ اس کے لیے کیا اقدامات کیے جارہے ہیں؟

جواب: ہم لوگ اس بات پر غوروفکر کررہے ہیں کہ کس طرح ریاضی پڑھائی جائے کہ بچے اس میں دلچسپی لے سکیں۔ مزید ہم سی.بی.ایس.ای. اور دوسرے اداروں کے ساتھ مشورہ کررہے ہیں کہ کس طرح تعلیمی بوجھ کے مسئلے کو حل کیا جائے۔ جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب آئی آئی ٹی کا ایک پروفیسر تین گھنٹے میں ایک پرچہ حل نہیں کرسکتا تو پھر ایک بچے سے یہ توقع کیوں کی جائے کہ وہ اسے تین گھنٹے میں حل کرے۔

سوال: آخر میں یہ سوال کہ جو نصاب تیار ہورہا ہے آپ اسے کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب: مجھے امید ہے کہ یہ فرسودہ بیانات کا مجموعہ نہیں ہوگا اور نہ اس میں پچھلی باتیں دہرائی جائیں گی۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ بہت ساری چیزیں نئی سمت میں گامزن ہوسکیں۔

سوال: بچے یشپال سے اتنی محبت کیوں کرتے ہیں؟

جواب: بچے مجھ میں اپنے کو دیکھتے ہیں اور میں ان میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔ علاوہ ازیں میری جملہ عملی کوششیں سب کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی رہتی ہیں اور محض لفظی بازیگری تک محدود نہیں رہی ہیں۔

(بشکریہ "ٹائمس آف انڈیا" دہلی، 2 جون 2005)

● **ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر یش پال این سی ای آر ٹی کی نیشنل اسٹیئرنگ کمیٹی کے چیئر پرسن ہیں۔**

سید حامد

وزیر اعظم کی اعلیٰ سطحی کمیٹی

جس کمیٹی کا نام زینتِ عنوان ہے وہ ان عام کمیٹیوں اور کمیشنوں سے مختلف ہے جو مرکزی حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً بنائے جاتے رہے ہیں۔ اول تو یہ کہ اس کمیٹی کو سال سوا سال کے اندر اعداد و شمار کو جمع کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے سے لے کر سفارشات پیش کرنے تک اپنا سارا کام بہرحال پورا کرنا ہے۔ کمیٹی بنانے والوں اور کمیٹی میں کام کرنے والوں، دونوں کو احساس ہے کہ ذرا بھی تاخیر ہوئی تو مقصد میں خلل پڑے گا۔ دوسرے کمیٹی کے کام کی نوعیت ہم خرما و ہم ثواب کی سی ہے۔ یعنی مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور معاشی حالت کا صحیح مستند اور معتبر بیان ملک کے سامنے آجائے اور اس بیان سے حکومت اور خود مسلمانوں کے لیے عمل کی راہیں نکل آئیں، ایسے عمل کی راہیں جو مبہم نہ ہوں، واضح اور متعین ہوں۔ مقصود تو حکومت کا یہی ہے کہ اعلیٰ سطحی کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ حکومت مطلوبہ اقدامات نہیں کرتی یا نہیں کر پاتی یا ان سے گریز کرتی ہے، یا لیت و لعل سے کام کرتی ہے (اور سیاست میں سیاسی مجبوریوں کی بنا پر تمام صورتیں ممکن ہیں) تو بھی کمیٹی کی کوششیں اکارت نہ جائیں گی۔ ملک کے سامنے بہرحال مسلمانوں کی اصل صورتِ حالات آجائے گی۔ اس کی موجودگی میں آئندہ کسی کو اس قسم کی بے بنیاد اور بادہوائی باتیں کہنے کی جرأت نہیں ہوگی کہ مسلمانوں کی منھ بھرائی یا ان کا تشٹی کرن کیا جا رہا ہے، یا ان کی طرف سے کئی کئی شادیاں کر کے اپنی آبادی بڑھانے کی کوئی منصوبہ بند کوشش کی جا رہی ہے یا وہ لڑکیوں کو پڑھانا نہیں چاہتے یا مدارس حالاتِ حاضرہ یا ملکی مفاد سے آنکھیں موندے ہوئے ہیں۔ غرض یہ کہ اس قسم کی خرافات جو مسلمانوں کے متعلق کدورتاً بعض تنگ نظروں کی طرف سے فضا کو مسموم کرنے کے لیے پھیلائی جاتی ہے، اس کے سوتے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔ رپورٹ میں دیے گئے اعداد و شمار ملک کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیں گے اور ہمارا وطن عزیز پریشان اور پشیمان ہو جائے گا کہ ہم نے اپنے پیروں پر کلہاڑی کیوں ماری اور اپنی سب سے بڑی اقلیت کو پچھڑنے کیوں دیا۔ اس کے پچھڑنے کا مطلب ہے ملک کی ترقی کی رفتار میں رکاوٹ لانا۔ خدا کا شکر ہے کہ ماضی قریب میں بعض بہت درد انگیز اور ناخوشگوار حادثات ہونے کے باوجود، ہندوستان کے مزاج کی رواداری اور خیراندیشی اور انسان دوستی برقرار ہے، اور اقلیتوں کا یہ ایک بڑا اثاثہ ہے۔ یہی نہیں متوقع رپورٹ کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ خود مسلمان بھی جھنجھلا کر اٹھیں گے، ان کی غیرت صورتِ حالات کی آگاہی سے ٹکرائے گی اور ان کی بے حسی میں دراڑ ڈالے گی اور ان میں سے کم سے کم کچھ تو عہد ساز محنت پر آمادہ کر دے گی۔ بجائے ایک مبہم ماتم کرنے کے انھیں اس کا موقع مل جائے گا کہ اپنے وسائل، اوقات اور توجہات کے ذرائع پہلے وہاں صرف کریں جہاں ضرورت سب سے زیادہ ہو۔ فلاحی کام کا ایک شیوہ یہ بھی ہے کہ اس کا فائدہ ایک جگہ محدود نہیں رہتا بلکہ سورج کی کرنوں کی طرح پھیل جاتا ہے، ہر طرف روشنی پھیلاتا ہے اور اطراف و اکناف کے باشندوں کو بھی محنت اور ایثار میں اپنی پیروی کرنے پر اُکساتا ہے۔

غرض یہ کہ آپ جس زاویے سے اسے دیکھیں یہ ایک سنہری موقع ہے ارباب اہتمام کے ساتھ تعاون کرنے کا، اس کا فائدہ گھوم پھر کر ہمیں ہی پہنچے گا۔ تعاون کا مفہوم یہی نہیں کہ کمیٹی کو ضروری معلومات فراہم کر دی جائیں بلکہ یہ بھی کہ کمیٹی کی دریافتوں اور سفارشوں سے عمل کی جو راہیں نکلتی ہوں ان کا دوگونہ تعاقب کیا جائے یعنی خود بھی، اور حکومت سے تقاضہ کر کے بھی۔ التماس، احتساب اور تعاقب۔ ان تینوں کو بروئے کار لائیے تب کہیں کام بنے گا۔

جو کام اس کمیٹی کو سونپا گیا ہے اس کی تفصیلات اخبارات میں چھاپی جا چکی ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے خواص و عوام، ہماری انجمنیں اور افراد ان موضوعات پر غور و فکر کر کے اپنی رائے سے کمیٹی کو مطلع کریں گے۔

راقم السطور کا خیال یہ ہے کہ اگر ان کلیدی موضوعات کو مدِنظر رکھتے ہوئے جو سرکاری اعلامیہ میں درج کیے گئے ہیں، مندرجۂ ذیل ذیلی امور کو ملحوظ رکھا جائے تو زیرِ غور مسئلے کا حق ادا کرنے میں شاید آسانی ہو۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ سوالات یہ ذیلی موضوعات اس مضمون نگار نے آپ قارئین کے لیے بطور مشورہ قائم کیے ہیں۔ ان کا کوئی تعلق بھی اعلیٰ سطحی کمیٹی کی سوچ سے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کمیٹی کی فکر تکمیل اس وقت پائے گی جب اس کے اہلِ تحقیق سارا دستیاب مواد جمع کر لیں گے اور مسلمانوں کے نمائندوں سے بالمشافہ گفتگو کر لیں گے اور ان محضروں کا مطالعہ کر لیں گے جو کمیٹی کو عوام و خواص، اداروں اور افراد کی طرف سے دیے جائیں گے۔ راقم السطور کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کے قارئین کرام، جو بفضلہٖ ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، اس اہم مسئلے کے جملہ پہلوؤں اور نکات پر ابھی سے غور کرنا شروع کر دیں:

(1) کیا آپ محسوس کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی حالت میں آپ کے قرب و جوار میں رہنے والی دوسری قوموں کی بہ نسبت کوئی تنزل آیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ کی رائے میں اس کی وجوہات کیا ہو سکتی ہیں؟

(2) مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب کیا ہیں۔ آپ کی رائے میں اس کو دور کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانے چاہئیں؟

(3) بہت سے مسلم بچے ابتدائی تعلیم کے دوران یا اس کے بعد اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے اسباب کیا ہیں؟

(4) بہت سے ان اسکولوں کا جنھیں مسلمان چلا رہے ہیں، معیار اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس کی وجوہات کیا کیا ہیں۔ آپ کی رائے میں ان کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے کیا کیا اقدامات ضروری ہیں؟

(5) آپ کے محلے میں ان بچوں کا تناسب کیا ہے جو (الف) مدرسوں (ب) عام اسکولوں، میں تعلیم پاتے ہیں؟

(6) آپ کی رائے میں کیا مدرسوں میں، دینی مضامین کو غالب رکھتے ہوئے، عصری مضامین کو نصاب میں شامل کرنا کارآمد ہوگا؟

(7) تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لیے کیا کیا تدابیر کرنی چاہئیں؟

(8) آپ کے علم میں ہوگا کہ حکومت نے مختلف اوقات میں اقلیتوں کی فلاح کے لیے پروگرام شروع کیے۔ آپ کے علم میں ان پروگراموں کی عمل آوری میں کوئی نقص تو نہیں تھا۔ اگر تھا تو کیا اس کا سبب عملہ کی بے توجہی یا عوام کا عدم تعاون یا ضروری اطلاعات کا فقدان تھا؟

(9) کیا آپ کے علاقے کے باشندوں کو حکومت کے ترقیاتی (ڈیولپمنٹ) پروگراموں اور مالیاتی اداروں سے ملنے والی امداد کی اطلاع عام طور پر رہتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا اس خامی کو دور کرنے کے لیے آپ عملی تجاویز دے سکتے ہیں؟

(10) آپ کی رائے میں کیا مسلمان انفارمیشن ٹیکنالوجی سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا مداوا کیسے کیا جائے؟

(11) کیا آپ کے قرب و جوار کے مقامی دفتروں میں مسلمان ایک معقول تعداد میں موجود ہیں۔ اگر نہیں تو اس کے اسباب کیا کیا ہیں۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں؟

(12) کیا ان علاقوں میں جہاں مسلمان کثرت سے آباد ہیں کارپوریشن یا میونسپل بورڈ ضروری سہولتیں فراہم کر رہے ہیں۔ اگر نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے اور اس کا مداوا کیوں کر کیا جائے؟

(13) مسلمانوں کے متعلق بعض حلقوں میں یہ تاثر رہا ہے کہ گاڑھی کمائی کو خرچ کرنے کا جہاں تک تعلق ہے ان کی ترجیحات شاید صحیح نہیں ہیں۔ ان کے یہاں اسراف ہے، وہ پس انداز کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے، اپنے بچوں کی تعلیم اور تربیت کا حق بھی بالعموم ادا نہیں کر پاتے۔ اس ضمن میں آپ کے تاثرات اور آپ کی تجاویز کیا ہیں۔ کیا عوام کو اس طرف متوجہ کرنے کے لیے آپ اپنے علاقے میں کوئی قدم اٹھائیں گے؟

(14) بے روزگار نوجوانوں کو روزگار دلانے، برسرکار لانے اور کارآمد بنانے کے لیے کیا طریقے اپنائے جائیں۔

(15) کیا عدم سلامتی کا احساس ترقی کی راہ میں حائل ہے؟ اس احساس کو کیسے دور کیا جائے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہیں؟

(16) کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ دستکاری اور چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتوں اور ''خود روزگاری'' کو عالمگیریت (گلوبلائزیشن) سے بڑا خطرہ ہے۔ اس خطرے کو ٹالا اور کم کیسے کیا جائے۔ اس ضمن میں آپ کی کوئی تجاویز ہیں؟ اگر عالمگیریت گھریلو محاذ پر بے روزگاری کا باعث ہوا تو ان لوگوں کو روزگار کیسے دلایا جائے گا؟

(17) یہ بات عام طور پر مشاہدے میں آرہی ہے کہ گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والے اکثر متعدی بیماریوں مثلاً تپ دق کا شکار اس وجہ سے ہوجاتے ہیں کہ ضروری صحت بخش غذا اور تازہ آب وہوا سے محروم رہتے ہیں۔ کاریگروں اور اہل حرفہ کی حالت اور صحت کو بہتر بنانے کے لیے آپ کی رائے میں حکومت کو کیا کرنا چاہیے؟

(18) آپ کے قرب و جوار میں بسنے والے مسلمان عام طور پر روزی کمانے کے لیے کون سا کام کرتے ہیں؟

(19) کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سرکاری دفتروں اور پرائیویٹ سیکٹر میں مسلمانوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے؟

(20) کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی ایسی بستیوں میں رہتی ہے جو گنجان ہیں اور ہوادار اور صاف ستھری نہیں ہیں؟

(21) مسلمانوں میں بچوں کو پڑھائی کے درمیان میں گھر پر بٹھا لینے کا چلن کیوں ہے۔ کیا اس کی ایک وجہ ان کے سماج کی ساخت ہے جس کے تحت والدین بچوں کو تعلیم سے بیچ میں سے اس لیے اٹھا لیتے ہیں کہ وہ باپ کے دھندے میں مدد کرے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر بچوں کی اس طرح کھوئی ہوئی اُجرت کی مالی تلافی کردی جاتی ہے تو تعلیمی حالات بہتر ہو جائیں گے؟

(22) کیا مسلمان قرضے کی اسکیموں سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں یا اس میں سود کے عنصر کی وجہ سے وہ فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔

(23) بعض حلقوں میں یہ احساس عام ہے کہ مسلمانوں کی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا متوسط طبقہ جو ترقی کی کرنوں کو پھیلا سکتا، بہت محدود ہے۔ کیا آپ کو اس رائے سے اتفاق ہے۔ اگر اتفاق ہے تو یہ بتایئے کہ کیا کیا جائے تاکہ یہ اہم طبقہ وسعت پا سکے؟

(24) کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ پرائیویٹ سیکٹر کے بڑھ جانے سے مسلمانوں کی حالت اور ابتر ہو جائے گی؟ ایسی صورت میں ان کے لیے کسب معاش کے ذرائع میں کیا تبدیلی سودمند ہوگی؟ کس قسم کی متبادل

کوشش درکار ہوگی؟

(25) مسلمان اپنے اہلِ وطن سے روزگار کے بازار میں مقابلہ کیوں نہیں کرپارہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے برابر بالآخر آجائیں گے یا آپ کو اندیشہ ہے کہ انھیں اپنے نسبتاً خوشحال اہلِ وطن سے جو خلیج دور رکھتی ہے وہ اور زیادہ چوڑی ہوجائے گی۔ فاصلہ کو کم کرنے کے لیے کیا کیا جائے؟

(26) بعض ریاستوں میں اقلیتوں کے لیے فیاضی کے ساتھ تعلیمی وظائف کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس پروگرام نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کس حد تک دور کی ہے۔ اس اسکیم کو کیسے بہتر بنایا جائے؟

(27) کیا یہ بات صحیح ہے کہ ہندی علاقے میں مسلمانوں کی تعلیم پر دو باتوں کا برا اثر پڑا ہے: (1) اردو کی تعلیم کا انتظام ناپید یا ناکافی رہا ہے (2) نصاب میں وقتاً فوقتاً ایسے مواد کا شامل کیا جانا جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں؟

(28) عام طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ مسلمانوں تک ترقی یا وکاس کی اسکیموں کا فائدہ اس لیے نہیں پہنچ پارہا ہے کہ ان کو ٹھیک سے نافذ نہیں کیا جاتا۔ ارادہ اور تعمیل کے درمیان کی اس خلیج کو پاٹا کیسے جائے؟

(29) فی زمانہ مسلمانوں میں مخلص قیادت کی کمی بری طرح محسوس کی جارہی ہے۔ یہ بات گاؤں، شہر، ضلع، ریاست اور مرکز سب پر صادق آتی ہے۔ قیادت کے فقدان کی وجہ کیا ہے۔ کیا وہ لوگ جو مسلمانوں کے تئیں خلوص رکھتے ہیں صاف صاف بات کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کیوں؟

(30) تجربہ یہ بتارہا ہے کہ مرکزی حکومت کے بعض پروگرام کچھ ریاستوں میں شرمندۂ تعمیل ہوتے ہی نہیں۔ اس کی وجہ کبھی تو وسائل کی کمی ہوتی ہے اور بعض اوقات سرد مہری۔ کیا ہم ایسی باخبر اور حساس رائے عامہ نہیں بنا سکتے جو فلاحی پروگراموں کی مناسب عمل آوری کو یقینی بنا سکے؟

(31) مسلمان فاصلاتی تعلیم سے پورا فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں، اس راہ میں کیا رکاوٹیں ہیں؟

(32) عورتوں کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے کیا کیا قدم اٹھانے چاہئیں؟

(33) کیا مسلمانوں کے پسماندہ طبقات دوسری قوموں کے پس ماندہ طبقات سے مقابلہ کر پاتے ہیں۔ کیا انھیں ملازمتوں اور درس گاہوں کے داخلوں میں پسماندہ طبقات کے کلاس کوٹا کا حصہ رسدی مل رہا ہے؟

(34) مسلمانوں کے زیر انتظام جو تعلیمی ادارے ہیں ان کا معیار عام طور پر اطمینان بخش کیوں نہیں ہے۔ ان کے معیار کو بلند کرنے کے لیے کیا تدابیر کی جائیں؟

(35) مسلمانوں میں غیر سرکاری اداروں یا ''این جی او'' کی بڑی کمی ہے۔ اس وجہ سے وہ فلاحی کام ٹھیک سے نہیں کرپاتے، نہ حکومت سے رفاہی کاموں کے لیے امداد حاصل کر پاتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی کوئی تجاویز ہیں؟

(36) حکومت نے مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن مسلمانوں کی تعلیمی فلاح کے لیے قائم کیا اور اسے قسطوں میں 100 کروڑ کا سرمایہ بھی دیا۔ محسوس کیا جارہا ہے کہ یہ سرمایہ ناکافی ہے اور کام کی وسعت کو دیکھتے ہوئے اس سرمائے کو بڑھا کر 500 کروڑ کردیا جائے۔ آپ کی اس ضمن میں کیا رائے ہے۔ آپ کی رائے میں مولانا آزاد فاؤنڈیشن سے مسلمانوں کی تعلیم کو حسب خواہ اور سرمایہ کاری کے مطابق فروغ پہنچ بھی پایا۔ اگر نہیں تو اس سلسلے میں آپ کیا تجویز کریں گے؟

(37) اہل حرفہ کو مضبوط کرنے اور حرفتوں کو فروغ دینے اور انھیں جدید وسائل سے لیس کرنے کے سلسلے میں آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہیں؟

(38) مسلم منتظمہ تعلیمی اداروں کے معیار میں بہتری لانے اور ان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے تجاویز دیجیے۔

(39) مسلمانوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مختلف سطحوں پر کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟

(40) عالمگیریت کے سیلاب میں ہماری دیرینہ اقدار بہتی جارہی ہیں۔ ثقافت کو اس کی یورش سے کس طرح بچایا جائے؟

(41) کیا آپ سمجھتے ہیں کہ محلّہ اور گھروں کے ماحول کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اصلاحی (ریمیڈیل) کلاسوں کا اہتمام ضروری ہے۔ اگر ہے تو اس کو وجود میں کیسے لایا جائے۔

(42) کیا آپ کے ذہن میں کچھ تجاویز مدارس کے نصاب کی توسیع کی ہیں تاکہ ان کے فارغین عالمی حالات اور رجحانات اور تغیرات سے باخبر ہوسکیں اور اگر، اور جب کبھی، چاہیں تو عصری تعلیم کی دھارا میں شامل ہوسکیں اور روزگار کے مواقع بھی ان کے لیے بڑھ جائیں۔ شرط بہرکیف یہ رہے گی کہ مدارس میں دینی تعلیم کا عنصر غالب رہے۔

(43) عصری تعلیمی اداروں کو بہتر ڈھنگ سے چلانے، اختلافات کو ختم کرنے اور مفاہمت کرنے کے لیے کیا یہ ممکن ہوگا کہ آپ کے شہر میں معتبر اور معزز افراد کی ایک کمیٹی بنادی جائے جو تعلیم کے معیار پر نظر رکھے اور جب ثالثی کی ضرورت ہو تو اعتماد کے ساتھ اس کام کو انجام دے سکے۔

(44) کیا آپ کے علم میں ایسے معاملات ہیں جن میں اداروں کو اقلیتی ادارے کی حیثیت ملنے میں ناروا تاخیر اور دشواریاں ہورہی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے اور اس کا مداوا کیوں کر کیا جائے؟

(45) مادری زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے حق سے بعض ریاستوں میں مسلمان محروم ہیں۔ اس حق کی بازیابی کا سروسامان کرنا کس کی ذمے داری ہے؟

(46) مسلمانوں کی معاشی حالت کو مختلف سطحوں پر بہتر بنانے کے لیے کیا اقدامات نتیجہ خیز ثابت ہوں گے؟

(بشکریہ ''قومی آواز'' نئی دہلی، 2مرجون 2005)

تحریر: ایل.بی.سنگھ
ترجمہ: شعیب عبداللہ

بنیادی تدریسی مہارتیں

تدریس ایک پیچیدہ عمل یا مشغلہ ہے۔ تدریس سے مراد بہت سی مختلف چیزوں سے ہوتی ہے کیوں کہ تدریس کا عمل ایک فرد سے دوسرے فرد اور ایک حالت سے دوسری حالت کے لیے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اسی سبب سے تدریس کی مختلف تعریفیں کی جاتی ہیں۔

تدریس کی ساخت اور پیچیدگی کو سمجھنے کے لیے ہم تدریس کے عمل کو ان سادہ تدریسی مشاغل یا سرگرمیوں میں تجزیہ یا تحلیل کرتے ہیں جن میں ایک استاد کمرۂ جماعت میں پڑھاتے وقت مصروف ہوتا ہے۔ یہ مشاغل تختہ سیاہ کا کام، سوالات کرنا، وضاحت کرنا وغیرہ ہوسکتے ہیں۔

تدریسی مہارتیں:

تدریسی مہارتیں زبانی بھی ہوسکتی ہیں اور غیر زبانی بھی۔ ان کو مزید ایسے اجزا میں تحلیل کیا جاسکتا ہے جو خود استاد کے مخصوص برتاؤں میں توڑے جاسکتے ہیں۔ استاد کے مختلف برتاؤں کا ایک ایسا سیٹ جن کا ایک مشترک مقصد ہو، ایک تدریسی مہارت کہلاتا ہے۔ اس طرح تدریس کا عمل آپس میں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تدریسی مہارتوں پر مبنی ہے۔

یہ تدریسی مہارتیں نہ صرف قابلِ مشاہدہ اور قابلِ پیمائش ہوتی ہیں بلکہ ان کی تربیت بھی دی جاسکتی ہے اور انھیں تربیتی حالت سے اصل کمرۂ جماعت کی حالت میں منتقل بھی کیا جاسکتا ہے۔ ایک استاد ان مہارتوں کا استعمال قبل تدریسی، تدریسی اور مابعد تدریسی مرحلوں میں اپنے مخصوص مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے۔

تدریسی مہارتوں کی شناخت کرنے کے لیے مختلف راہیں اختیار کی جاسکتی ہیں ان میں سے کچھ جو مخصوص اہمیت کی حامل ہیں، مندرجۂ ذیل ہیں:

(الف) کمرۂ جماعت کا مشاہدہ کرنا۔
(ب) انٹرویو کے ذریعے استاد کے کام کا تجزیہ کرنا۔
(ج) نصابِ تعلیم کا تجزیہ کرنا۔
(د) ایک اچھے تدریسی ماڈل کا تصور کرنا۔

مندرجۂ ذیل مہارتیں کچھ ایسی بنیادی/مرکزی مہارتیں ہیں جن کا استعمال اسکول میں کسی بھی جماعت کے لیے عملِ تدریس کے دوران لازمی ہے۔

تدریسی مہارت	مقصد
1. تختہ سیاہ کا استعمال	مؤثر بصری مواصلات
2. سوال پوچھنا	سیکھنے والے میں سوچنے کے عمل کا آغاز کروانا
3. تشریح کرنا	تفہیم پیدا کرنا
4. مثالوں کے ذریعے وضاحت کرنا	مزید تفہیم
5. تقویت پہنچانا	سماجی اعتبار سے پسندیدہ برتاؤ کو مضبوط بنانا
6. مُہیج میں تبدیلی	توجہ مبذول کرانا اور اسے قائم رکھنا

طلبہ میں تدریسی مہارتوں کی نشوونما:

استاد بننے کی تربیت حاصل کرنے والے طلبہ میں تدریسی مہارتوں کی نشوونما اور ان کا حصول خورد تدریسی تکنیک (مائیکروٹیچنگ تکنیک Micro Teaching Technique) کے ذریعے ہوتا ہے۔ تربیت کی یہ تکنیک، تدریسی مہارتیں پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مائیکروٹیچنگ کے طریقۂ کار میں مندرجۂ ذیل اقدام شامل ہیں، جو مائیکروٹیچنگ سائیکل کہلاتا ہے۔

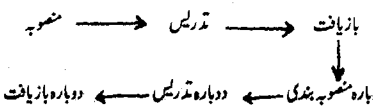

یہ اقدام اس وقت تک دہرائے جاتے رہتے ہیں، جب تک کہ شاگرد۔ استاد (Pupil Teacher)، مہارت کے استعمال پر عبور نہیں حاصل کرلیتا۔ ایک تدریسی مہارت کی مشق کرنے کے لیے مائیکروٹیچنگ تربیت میں مندرجۂ ذیل باتیں شامل ہیں:

(الف) مشق کرنے کے لیے ایک واحد مہارت

(ب) پڑھائے جا رہے مضمون کے ایک یا دو تصور

(ج) 5 سے 10 طالب علموں کی جماعت

(د) 5 سے 10 منٹ تک پڑھانا

کسی مہارت کو مکمل عبور کی حد تک حاصل کرانے میں منظم باز یافت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تمام بنیادی تدریسی مہارتوں کے حصول کے بعد، یہ ممکن ہے کہ ان سب کو کمرۂ جماعت میں موثر تدریس کے لیے ایک ساتھ یکجا کیا جا سکے۔

ذیل میں مختلف مہارتوں کی تشریح کی جا رہی ہے۔

چھان بین کرنے والے سوالات پوچھنے کی مہارت:

جب ایک استاد اپنی جماعت میں طالب علموں سے سوالات پوچھتا ہے تو مختلف صورتیں پیش آ سکتی ہیں، جو اس طرح ہیں:

(1) طلبہ کوئی جواب نہ دیں۔

(2) طلبہ غلط جواب دیں۔

(3) طلبہ کچھ درست اور کچھ غلط جواب دیں۔

(4) طلبہ درست جواب دیں۔

(5) طلبہ نامکمل جواب دیں۔

ان تمام صورتوں سے کس طرح نپٹا جائے، یہی اس مہارت کا مرکزی خیال ہے۔ کوئی جواب نہ دینے یا غلط جواب دینے کی صورت میں، استاد بچوں کے جوابات کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ ان سے بہت سے ایسے سوال ان چیزوں پر پوچھتا ہے جن سے وہ واقف ہیں اور اس طرح درست جواب تک ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ جب جواب درست ہو، تو استاد طالب علم کی موادِ تعلیم کی گہرائی میں اترنے میں مدد کر سکتا ہے اور اس کے لیے ''کیسے''، ''کیوں'' اور کبھی کبھی ''کیا'' قسم کے سوال بھی پوچھتا ہے۔ اس مہارت میں شاگردوں کے جوابات کی گہرائی میں اترنے کے لیے سوالات کا ایک سلسلہ شامل ہوتا ہے۔

ایک اچھے سوال کی کیا خوبیاں ہیں؟

اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ سوال کو عمدہ اور معیاری ہونا چاہیے تو آپ درست ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوال، سادہ، مختصر اور قواعد کے لحاظ سے درست ہونا چاہیے۔ سوال پوری جماعت کو مخاطب کرکے پوچھا جانا چاہیے، کسی ایک طالب علم کو مخاطب کرکے نہیں کیوں کہ سوال کا مقصد جماعت کے تمام طالب علموں کو زیرِ بحث نکتے پر غور کرنے کے لیے اُکسانا ہے۔ طلبہ کو سوچنے کے لیے کچھ وقت دیا جانا چاہیے اور پھر استاد کو کسی ایک طالب علم کو جواب دینے کا اشارہ کرنا چاہیے۔

اس مہارت کے اجزا درج ذیل ہیں:

(i) یاددہانی میں امدادی تکنیک (Prompting technique):

اس تکنیک کا مطلب ہے کہ جب کوئی جواب نہ دیا جائے یا غلط جواب دیا جائے تو اس وقت طالب علم کے جوابی عمل کی گہرائی میں جانا۔ اس موقعے پر طالب علم کو اشارات اور یاددہانی کرانے کے لیے امدادی لقمات کا ایک سلسلہ قدم بہ قدم سوالات کرکے مہیا کیا جاتا ہے تاکہ طالب علم کی درست جواب تک رہ نمائی کی جا سکے۔

(ii) مزید اطلاعات طلب کرنا:

یہ تکنیک اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب شاگرد کا جواب نامکمل ہے یا اس کا کچھ حصہ درست ہے۔ استاد مزید چھوٹے سوال پوچھ کر یا ایسے حالات پیدا کرکے جن میں طالب علم مزید سوچ سکے، طالب علم کی اپنے پہلے دیے ہوئے جواب کی وضاحت کرنے یا اسے سمجھانے یا اس کی تفصیل مہیا کرنے میں مدد کرتا ہے۔

(iii) دوسرے طالب علم سے پوچھنا:

اس تکنیک میں اسی سوال کو دوسرے طالب علم سے پوچھا جاتا ہے۔ اس تکنیک کا اصل مقصد ہے کہ طالب علموں کی شرکت کو بڑھایا جا سکے۔ اگر کوئی جواب نہ حاصل ہو یا غلط جواب حاصل ہو تو مزید اطلاعات طلب کرنا، دوسرے طالب علموں سے پوچھنے کے مقابلے میں بہتر ہے۔

(iv) دوبارہ مرتکز کرنا (Refocussing):

یہ تکنیک اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب درست جواب حاصل ہوتا ہے۔ اس تکنیک میں شاگرد کے جواب میں شامل اظہار کا مقابلہ دوسرے مظہر سے مماثلت/فرق یا دونوں میں رشتہ معلوم کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس نکتہ میں بیان کی گئی ایک چیز دوسری چیز سے کیسے مختلف ہے؟ طالب علم کا ایک جواب، دوسرے نکتہ سے کس طرح متعلق ہے؟ ایک چیز اور دوسری چیز میں کیا مماثلت ہے؟ اس طرح کے سوالات طالب علم سے کیے جاتے ہیں۔

(v) ناقدانہ آگہی میں اضافہ کرنا (Increasing Critical Awareness):

یہ تکنیک اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب طالب علم کا جواب درست

ہو۔ اس موقع پر طالب علم کو، جو کچھ وہ جانتا ہے، اس سے آگے سوچنے کی ترغیب دینے کے لیے استاد اعلیٰ معیار کے سوالات کرتا ہے۔ جس میں زیرِ بحث نکتے سے متعلق کیسے، کیوں اور کبھی کبھی کیا قسم کے سوالات شامل ہوتے ہیں۔

تقویت کی مہارت (The Skill of Reinforcement):

کمرۂ جماعت میں جوابی عمل میں شامل طالب علموں کو اپنے برتاؤں کے ساجی طور پر پسند کیے جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کی وجہ سے وہ استاد کے ذریعے پوچھے گئے سوالوں کے جواب دینے کے ہمیشہ خواہش مند رہتے ہیں۔ سوال کا جواب دینے کے بعد ان کی خواہش ہوتی ہے کہ انھیں پتہ چلے کہ ان کا جواب کس حد تک درست تھا اور ان کے جواب سے استادِ محترم کتنے خوش ہوئے۔ موافق حالات میں وہ خود بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور ہمیشہ جواب دینے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر استاد ان کے جواب پر کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کرتا، تو ان کی جواب دینے کی خواہش بھی رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی ہے۔ تکنیکی اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ طالب علموں کے جوابات پر استاد کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مثبت تقویت بخش ردِّعمل کا اظہار کرے اور منفی تقویت بخش ردِّعمل سے زیادہ سے زیادہ گریز کرے تاکہ جماعت کی سرگرمیوں میں طالب علموں کی شمولیت زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔

اس مہارت یا تقویت کے مؤثر استعمال کے لیے ہمیں مہارت کے برتاوی اجزا سے واقفیت حاصل کرنا ہوگی۔ یہ اجزا ہیں:

(i) مثبت لفظی تقویت بخش اجزا
(ii) مثبت غیر لفظی تقویت بخش اجزا
(iii) منفی لفظی تقویت بخش اجزا
(iv) منفی غیر لفظی تقویت بخش اجزا
(v) زائد لفظی تقویت بخش اشارات
(vi) طالب علموں کے جوابات کو دہرانا اور انھیں بہتر الفاظ میں ادا کرنا
(vii) طلبہ کے جوابات تختۂ سیاہ پر لکھنا

ان اجزا پر ہم ذیل میں بحث کریں گے۔

(i) مثبت لفظی تقویت بخش اجزا:

اس میں وہ لفظی یا لسانی عبارتیں شامل ہیں جن کے استعمال سے مثبت تقویت ملتی ہے، مثلاً طالب علم کے جواب دینے کے بعد اچھا، بہت اچھا، درست، صحیح، ٹھیک، ہاں، بہت اچھا کہا، وغیرہ کہنا۔ بعض مرتبہ ایسے الفاظ اور جملے: آگے بڑھیے، کہتے رہیے، جاری رکھیے وغیرہ بھی تقویت پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔ ذاتی اندازۂ قدر پر مبنی اور حمایتی نوعیت کی رائیں اور نتائج کی معلومات بھی لفظی مثبت تقویت بخش اجزا کی مثالیں ہیں۔ جب ایک استاد طلبہ کے تصورات و خیالات کو مزید تفصیل کے لیے استعمال کرتا ہے، تب بھی وہ تقویت فراہم کرتا ہے۔

(ii) مثبت غیر لفظی تقویت بخش اجزا:

جب استاد طالب علموں کے جوابات کو تقویت بخشنے کے لیے اشارے، حرکات و سکنات اور عملی برتاؤ استعمال کرتا ہے تو اسے مثبت غیر لفظی تقویت بخشنا کہتے ہیں۔ اس جز کے چار عنصر ہیں۔ (الف) سر ہلانا اور مسکرانا (ب) جواب دینے والے طالب علم کی طرف حرکت کرنا (ج) دوستانہ مسکراہٹ یا انداز (د) شاگرد کے جواب کو تختۂ سیاہ پر لکھنا۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ مثبت غیر لفظی تقویت، برتاوی تبدیلیاں لانے میں زیادہ مؤثر ہوتی ہے کیونکہ مثبت تقویت پہنچانے والے الفاظ بار بار استعمال کیے جانے سے اپنی تاثیر کھو دیتے ہیں اور آخر میں وہ صرف استاد کا انداز یا تکیہ کلام بن کر رہ جاتے ہیں۔

(iii) منفی لفظی تقویت بخش اجزا:

حالانکہ اس قسم کی تقویت کا مقصد ایک خاص قسم کے برتاؤ کے تعداد کو بڑھانا ہے، عملی صورت میں کچھ خاص ناپسندیدہ تقویت بخشنے والے اجزا بیان کیے گئے برتاؤ کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی تقویت کا دوسرا اثر تحریک کی سطح اور دلچسپی میں کمی بھی ہوتی ہے۔ غلط، نہیں، غیر درست، صادق نہیں، بے وقوف، بے عقل، چپ رہو وغیرہ الفاظ، منفی لفظی تقویت بخش اجزا کی مثالیں ہیں اور آموزش میں مدد کرنے کے لیے ان کا استعمال زیادہ نہیں کیا جانا چاہیے۔

(iv) منفی غیر لفظی تقویت بخش اجزا:

اس طرح کی تقویت ان طالب علموں کو پہنچائی جا سکتی ہے جو کچھ خاص ناپسندیدہ برتاؤں کا احساس رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر تیوری چڑھانا، گھور کر دیکھنا، سر ہلانا، ہاتھوں سے بے صبری کے ساتھ میز وغیرہ تھپتھپانا، کسی خاص طالب علم کو نظر انداز کرنا اور اس سے دور ہٹنا۔ لیکن اس قسم کے تقویت بخش اجزا کو احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے کیونکہ اس سے استاد اور شاگرد کا آپسی تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اس سے طالب علموں کی انا بھی مجروح ہوتی ہے اور ان کے حوصلے پست ہوتے ہیں۔

(v) زائد لفظی اشارات:

کبھی کبھی استاد کچھ ایسی آوازیں نکالتا ہے، جیسے آہا، ہوں وغیرہ، تا کہ طالب علم کو اپنے جواب دینے کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے حوصلہ افزائی ہو سکے۔ ایسا اس وقت کیا جاتا ہے جب طالب علم کا جواب لمبا ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اگر ایسے لفظی اشارے ان مقامات پر دیے جائیں جہاں طالب علم نے کچھ بامعنی الفاظ یا جملے استعمال کیے ہوں۔ لیکن زائد لفظی تقویت بخش اشارات کا بہت زیادہ استعمال ان کی افادیت کو کم کر دیتا ہے اور ایک حد سے زیادہ استعمال کے بعد یہ بھی استاد کے تکیہ کلام کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

(vi) طالب علم کے جواب کو دھرانا یا دوسرے الفاظ میں ادا کرنا:

استاد ایک طالب علم کے درست جواب کو دوسرے طلبہ کے فائدے کے لیے دہراتا ہے یا دوسرے (بہتر) لفظوں میں بیان کرتا ہے۔ ایسے برتاؤ سے طالب علموں کو تقویت ملتی ہے۔ مگر استاد کو صرف ان ہی جوابوں کو دہرانا چاہیے جن میں کوئی خاص بات ہو یا جو اہم ہوں۔

(vii) طلبہ کے جواب تختۂ سیاہ پر لکھنا:

طلبہ کو تقویت پہنچانے کے لیے استاد کبھی کبھی ان کے درست اور طبع زاد جوابوں کو تختۂ سیاہ پر لکھ سکتا ہے۔ اس سے ایک مزید فائدہ یہ بھی ہے کہ طلبہ کی توجہ بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

مہیج میں فرق کرنے کی مہارت

(Skill of Stimulus Variation):

مہیج میں فرق کی مہارت کا مطلب ہے کہ ماحول میں مہیج کی تبدیلی کر کے طالب علموں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا اور مرتکز کرنا تا کہ طالب علموں کی توجہ حاصل ہو سکے اور قائم رہ سکے اور طالب علموں کی دلچسپی اور تحصیل میں اضافہ ہو سکے۔

مندرجہ بالا مہیج میں فرق کی مہارت کی تعریف کی روشنی میں اس مہارت کے اجزا ذیل میں بیان کیے جا رہے ہیں۔

(i) استاد کی حرکات:

سبق کے دوران استاد ایک مقام سے دوسرے مقام تک حرکت کرتا ہے، جیسے تختۂ سیاہ کی طرف جاتا ہے یا بامقصد طور پر کسی شاگرد کی طرف بڑھتا ہے۔ ایسا کرنے کا مقصد ہو سکتا ہے کہ تختۂ سیاہ پر کچھ خاص نکات کا لکھنا ہو، تا کہ طلبہ کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو سکے یا ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا ہو یا کسی خاص مسئلے کو حل کرنے میں ان کی مدد کرنا ہو۔ استاد کی یہ بامقصد حرکت طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور انھیں ہوشیار و چوکنا رکھتی ہے۔ طلبہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے اور اس توجہ کو قائم رکھنے کے لیے، استاد کو بے مقصد اور عادتاً اِدھر اُدھر ٹہلنے یا درجہ میں آگے پیچھے چلنے سے گریز کرنا چاہیے۔ ایسی بے مقصد حرکات اکتاہٹ اور کبھی کبھی توجہ میں خلل پیدا کر سکتی ہیں۔

(ii) استاد کے اشارے:

یہاں اشاروں سے مطلب جسم کے حصوں کی وہ حرکات ہیں جو توجہ حاصل کرنے، جذبات کا اظہار کرنے، اہمیت ظاہر کرنے یا ناپ اور حرکتوں کو ظاہر کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ مناسب اشاروں کے ذریعے لفظی اظہار کو تقویت ملتی ہے اور طلبہ کی توجہ بھی حاصل ہوتی ہے۔ زبانی پیغام کے معنی کو سمجھانا، اشاروں کے ساتھ زبانی پیغام کے مقابلے میں کم مؤثر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک استاد ''معمارانِ قوم'' پڑھا رہا ہے اور سبق کے خاتمے پر وہ کہتا ہے ''اس وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ یہ ملک کے مستقبل کے معمار ہیں۔'' (اور اپنی مٹھی زور سے میز پر مارتا ہے۔) اس لیے مؤثر ابلاغ اور توجہ قائم رکھنے کے لیے مناسب اشاروں کا استعمال کرنا چاہیے۔ کچھ اشارے استاد کے مخصوص انداز کا حصہ بن جاتے ہیں اور پھر اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ اسی لیے استاد کو چاہیے کہ وہ ایسے اشاروں پر قابو پانے کی کوشش کرے۔

(iii) آواز کے اتار چڑھاؤ میں تبدیلی:

بعض مرتبہ جذبات کا اظہار کرنے کے لیے یا ایک خاص نکتہ پر زور دینے کے لیے لہجے میں یا آواز میں یا زبانی اظہار کی رفتار میں اچانک اور نمایاں تبدیلی کرنا پڑتی ہے۔ آواز کے اتار چڑھاؤ میں اس تبدیلی سے طلبہ کی توجہ قائم رہتی ہے اور سبق اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔ جب ہم یکساں آواز میں پڑھاتے جاتے ہیں اور ہماری آواز میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا تو طلبہ کی توجہ بٹنے لگتی ہے اور کبھی کبھی وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگتے ہیں یا سونے بھی لگتے ہیں۔ یہ ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ استاد مناسب موقعوں پر اور مناسب مقام پر یہ اتار چڑھاؤ پیدا کر سکے۔

(iv) حواسی مرکز میں تبدیلی:

اس سے مراد ہے کہ اس حسی عضو میں تبدیلی جسے طلبہ استعمال کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر سننے کی بجائے دیکھنا، پڑھنے کی بجائے لکھنا، بولنے کی جگہ کرنا، اور استاد کا بولنے کی جگہ تختۂ سیاہ پر لکھنا اور تختۂ سیاہ پر لکھنے کی جگہ مظاہرہ کرنا وغیرہ۔ یہ سب حواسی تبدیلیوں کی مثالیں ہیں۔ انھیں زبانی۔ بصری

سوئچنگ یا منتقلی بھی کہتے ہیں۔ یہ طریقے توجہ اور تحریک کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ (الف) زبانی/بصری (ب) زبانی/زبانی۔بصری (ج) بصری/زبانی۔بصری۔

(الف) زبانی/بصری: جب توجہ کا مرکز لفظی مہیج سے بصری مہیج میں تبدیل ہوتا ہے، مثلاً استاد بولتے بولتے ایک تصویر یا چارٹ دکھاتا ہے۔ یہاں پر حواسی مرکز زبانی سے بصری میں تبدیل ہو رہا ہے۔ اب اگر استاد دوبارہ تقریر کرنا شروع کر دیتا ہے تو وہ پھر بصری مہیج سے زبانی مہیج پر آ جاتا ہے۔

(ب) زبانی/بصری۔زبانی: یہاں پر تبدیلی زبانی مہیج سے زبانی اور بصری مہیج اور اس کا معکوس کی شکل میں ہوتی ہے۔ اگر استاد تقریر کرتے ہوئے ایک ماڈل یا چارٹ دکھا کر اس کے مختلف حصے بیان کرنے لگتا ہے تو یہ زبانی سے زبانی بصری سوئچنگ کی مثال ہے۔

(ج) بصری/زبانی۔بصری = یہاں تبدیلی بصری مہیج سے زبانی اور بصری مہیج ہے اور اس کے برعکس بھی۔ جب استاد ایک تجربے کا خاموشی سے مظاہرہ کرتا ہے اور پھر تختۂ سیاہ پر ایک ڈائیگرام کی مدد سے اس مظہر کو سمجھاتا ہے تو یہ تبدیلی بصری سے زبانی۔بصری کی طرف ہے۔

(v) باہم عمل کے اندازوں میں تبدیلی:

جب دو یا دو سے زیادہ افراد آپس میں بات چیت کرتے ہیں تو ان کے درمیان باہم عمل (Interaction) ہوتا ہے۔ کمرۂ جماعت میں تین قسم کے باہم عمل ممکن ہیں۔ (الف) استاد ــ جماعت (ب) استاد ــ شاگرد (ج) شاگرد ــ شاگرد باہم عمل۔

(الف) استاد ــ جماعت باہم عمل: اس باہم عمل میں استاد پوری جماعت سے اظہار خیال کرتا ہے اور پوری جماعت کا کچھ حصہ جوابی عمل کرتا ہے۔

(ب) استاد ــ شاگرد باہم عمل: اس انداز کی ترسیل اس وقت ہوتی ہے جب استاد کی بات چیت کا رخ اس مخصوص طالب علم کی طرف ہوتا ہے جسے جواب دینا ہے۔

(ج) شاگرد ــ شاگرد باہم عمل: جب شاگردوں کے درمیان بحث ہوتی ہے اور استاد اس بحث میں حصہ نہیں لیتا تو اس باہم عمل کو شاگرد ــ شاگرد باہم عمل کہتے ہیں۔

اگر باہم عمل کا ایک انداز جماعت میں زیادہ دیر تک جاری رہتا ہے تو کچھ بوریت ہونے لگتی ہے۔ اس لیے طلبہ کی توجہ حاصل کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے باہم عمل کے انداز میں تبدیلی لانا بہتر ہے۔

(vi) مرتکز کرنا:

اس کا مطلب ہے طلبہ کی توجہ اس خاص نکتے کی طرف مبذول کرانا جس کا انھیں مشاہدہ یا احساس کروانا ہے۔ یہ ارتکاز، زبانی برتاؤ کے ذریعے، یا اشاروں کو استعمال کر کے یا دونوں کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(الف) زبانی ارتکاز: "تختۂ سیاہ پر دیکھو"، "توجہ سے سنیے"، "تجربہ دیکھیے" وغیرہ۔

(ب) اشاراتی ارتکاز: یہ کسی مخصوص شے کی طرف کسی خاص اشارے کے ذریعے توجہ مبذول کرا کے کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر انگلی سے اشارہ کرنا، یا تختۂ سیاہ پر اہم الفاظ کو خط کشیدہ کرنا۔

(ج) زبانی و اشاراتی ارتکاز: ایک شے کی طرف اشارے کرتے ہوئے یہ کہنا کہ ادھر دیکھیے، اس ارتکاز کی مثال ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ طلبہ کی توجہ حاصل کرنے میں اس قسم کا ارتکاز زیادہ مؤثر ہے۔

(vii) توقف:

اس سے مراد ہے کہ استاد کا تقریر کے دوران جان بوجھ کر کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کر لینا۔ اس توقف (Pause) کا مقصد ہے: (الف) طلبہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا (ب) طلبہ کو وقت دینا کہ وہ استاد کے سوال کا جواب دینے کے لیے درست الفاظ سوچ سکیں (ج) خیالات اور تصورات کو یکجا کرنے کے لیے وقت دینا۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر استاد بولتے بولتے اچانک رک جاتا ہے تو طالب علم استاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کچھ احتیاطیں تجویز کی جا سکتی ہیں: سب سے پہلے، توقف، مناسب موقع پر ہونا چاہیے۔ پھر توقف بہت لمبا یا بہت مختصر نہیں ہونا چاہیے۔ مزید ایک غیر مناسب مقام/موقع پر بھی توقف کیا جا سکتا ہے، اگر مقصد ان طلبہ کو متوجہ کرنا ہے جو توجہ نہیں دے رہے ہیں۔

(viii) طلبہ کی شمولیت:

اس سے مطلب ہے طلبہ کی جسمانی/طبعی شمولیت، جس کے لیے استاد نے ہدایت کی ہے یا جو استاد چاہتا ہے۔ مثلاً تجربے کے سامان کو برتنا، ڈراما کرنا وغیرہ۔ طالب علم کے ذریعے کی گئی حرکات ایک طالب علم کو یکسانیت توڑنے کا موقع فراہم کرتی ہیں اور سبق میں اس کی دلچسپی میں اضافہ کرتی ہیں۔

شاگردوں کی شمولیت میں اضافہ کرنے کی مہارت

(Skill of Increasing Pupil Participation):

مؤثر تدریسی و آموزشی سرگرمیوں کے لیے طالب علموں کی فعال شمولیت لازمی ہے۔ کمرۂ جماعت میں کی جا رہی سرگرمیوں میں طلبہ کی فعال

شمولیت ان کے ردِعمل کے برتاؤ (Reaction Behaviour) سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان کا ردِعمل ظاہر کرتا ہے کہ وہ استاد کے ذریعے پوچھے گئے سوالوں کے جواب دینے کے کتنے خواہش مند ہیں اور وہ زیر بحث عنوان سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کتنا/کس حد تک کرتے ہیں۔

اس مہارت میں شاگردوں اور استاد دونوں کی سرگرمیاں شامل ہیں۔ طالب علم کی سرگرمی میں اس کا زبانی جواب اور آغاز شامل ہیں۔ استاد کی سرگرمی میں لفظی اور غیر لفظی دونوں برتاؤ جو طلبہ کی شمولیت کو مہیج کرتے ہیں، شامل ہیں۔

طلبہ کی فعال شمولیت کی حوصلہ افزائی کرنے کی مہارت میں شامل اجزا ہیں:

(i) سوالات (الف) نچلے درجے کے سوالات (ب) اعلیٰ درجے کے سوالات (ج) طویل جواب والے سوالات (د) غیر متعین جواب والے سوالات (ہ) اشارہ دینے والے سوالات (و) دوسرے طالب علم سے سوال کرنا۔

(ii) تقویت کا استعمال (الف) لفظی (ب) غیر لفظی

(iii) طلبہ کے خیالات استعمال کرکے

(iv) باہم عمل میں تبدیلی کرکے

(v) طلبہ کی جسمانی شمولیت

(vi) مناسب توقف

ان اجزا کو ذیل میں مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

(i) سوالات:

سوال کمرۂ جماعت میں ایک مہیج ہے جو طلبہ کے جواب کی شکل میں ان کی شمولیت حاصل کرتا ہے۔ استاد ضرورت اور موقعے کے لحاظ سے مختلف قسم کے سوالات استعمال کرسکتا ہے۔

(الف) نچلے درجے کے سوالات: استاد کو نچلے درجے کے سوالات، جیسے یادداشت قسم کے، پوچھنے چاہئیں تاکہ طلبہ اپنی سابقہ معلومات کا تعلق موجودہ موادِ تعلیم سے قائم کرسکیں۔ طلبہ جواب دینے کے لیے آمادہ ہوں گے کیونکہ سوالات کا تعلق ان کی سابقہ معلومات سے ہے۔

(ب) اعلیٰ درجے کے سوالات: ایسے سوالات زیرِ مطالعہ مواد کی چھان بین کرنے میں طلبہ کی مدد کرتے ہیں۔ جب ایک بار طلبہ حصہ لینا شروع کردیں تو استاد کو چاہیے کہ ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہے، چاہے ان کے جوابات درست نہ بھی ہوں۔ اس سے طلبہ کے جوابی عمل کے برتاؤ میں اضافہ ہوگا۔

(ج) طویل جواب والے سوالات: طلبہ کو بچوں سے ایسے سوالات پوچھنا چاہئیں جن کے جواب دو یا تین سطروں میں دیے جاسکیں۔ کیونکہ ایسے جواب دینا آسان ہوگا اس لیے طلبہ میں کمرۂ جماعت کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی خواہش پیدا ہوگی۔

(د) غیر متعین جواب والے سوالات: ان سوالات کو ''منتشر سوالات'' بھی کہتے ہیں۔ ان سوالات میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ طلبہ کی شمولیت حاصل کرسکیں۔ ان کے ایک متعین جواب سے زائد جوابات ہوتے ہیں۔

(ہ) اشارہ فراہم کرنے والے سوالات: کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ استاد کے ذریعے پوچھے گئے سوال کا طالب علم جواب نہ دے سکے۔ لیکن اگر استاد مناسب اشارہ دے تو طالب علم درست جواب دے سکے گا۔

(و) دوسرے طالب علم سے پوچھا گیا سوال: اگر اشارہ دینے کے بعد بھی ایک طالب علم جواب نہیں دے پاتا تو استاد کو چاہیے کہ وہی سوال دوسرے طالب علم سے پوچھے۔ اس سے پچھلے طالب علم کو بھی اپنی گزشتہ معلومات کو دوبارہ یکجا کرنے کا موقع ملے گا۔

(ii) تقویت کا استعمال:

شمولیت اور درست جوابوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے، استاد، لفظی اور غیر لفظی، دونوں قسم کی تقویت پہنچانے والے اجزا کا استعمال کرسکتا ہے۔ لفظی تقویت کے اجزا کو استعمال کرتے وقت، درست جوابوں پر استاد جواب دینے والے طالب علم کے قریب جاسکتا ہے، مسکرا سکتا ہے، چہرے پر دوستانہ تاثر لاسکتا ہے، اور غلط جوابوں پر غصے سے دیکھ سکتا ہے، جواب دے رہے طالب علم سے دور ہٹ سکتا ہے، وغیرہ۔

(iii) شاگرد کا خیال استعمال کرنا:

استاد اپنے کیے گئے سوال کے جواب میں شاگرد کا خیال استعمال کرسکتا ہے۔ اس سے طالب علم کو تدریسی و آموزشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ترغیب ملے گی۔

(iv) باہم عمل کے طریقوں میں تبدیلی لانا:

کمرۂ جماعت میں تین قسم کے باہم عمل ہوسکتے ہیں۔ یہ ہیں: (i) استاد۔ جماعت (ii) استاد۔شاگرد (iii) شاگرد۔شاگرد۔ استاد کو چاہیے کہ وہ جماعت میں ان طریقوں کو تبدیل کرتا رہے۔

(v) طلبہ کا جسمانی/طبعی طور پر حصہ لینا:

استاد طالب علم سے تختۂ سیاہ پر جواب لکھنے کے لیے کہہ سکتا ہے، کوئی ڈائیگرام بنوا سکتا ہے۔ جب طالب علم تختۂ سیاہ پر کام کررہا ہو تو استاد لفظی اور غیر لفظی تقویت بخش اجزا استعمال کرسکتا ہے۔ یہ طالب علم کے حصہ لینے میں

اضافہ کرے گا۔

(vi) مناسب توقف استعمال :

مناسب موقعوں/مقامات پر توقف کا استعمال بچے کی مواد مضمون کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔ توقف کے ذریعے لکھے ہوئے اور چھپے ہوئے الفاظ میں جان پڑ جاتی ہے اور اس سے بچے جذباتی طور پر بھی ترغیب حاصل کرتے ہیں۔ استاد کو توقف کے مناسب استعمال پر پورا دھیان دینا چاہیے۔ توقف کا غلط استعمال تدریس کے تاثر کو کم کردے گا۔

ابتدائی سطح پر تدریسی مہارتیں:

ابتدائی سطح پر طالب علم 6 سے 11 سال تک کی عمر کے ہوتے ہیں۔ اس عمر کے بچوں کو گانے، کھیلنے، اشیا کو بنانے اور توڑنے، تحت خوانی، ڈراما کرنے وغیرہ کا شوق ہوتا ہے۔ ان مشاغل/سرگرمیوں کے ذریعے پڑھانے سے بچوں میں صحت مند رویے پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے ایک ابتدائی اسکول کے استاد میں جن مہارتوں کا ہونا ضروری ہے، وہ ہیں:

(i) حکایت کہنے/قصہ گوئی کی مہارت (ii) تحت خوانی کی مہارت (iii) بچوں کی شمولیت کے لیے حوصلہ افزائی کرنے کی مہارت (iv) ڈراما کرنے کی مہارت (v) کمرۂ جماعت کی تنظیم کی مہارت۔

ان میں سے اول الذکر دو مہارتوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(i) حکایت کہنے کی مہارت:

بچوں کو کہانی، واقعات، قصے وغیرہ سننے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کی اس دلچسپی کا فائدہ، ماہرین تعلیم نے بچوں کو تعلیم دینے میں اٹھایا ہے۔ حکایت کہنے یا قصہ سنانے کی مہارت، استادوں، خاص طور پر ابتدائی سطح کے استادوں کے لیے ایک لازمی مہارت سمجھی جاتی ہے۔ قصہ سنانا ایک مہارت ہے جو ایک استاد تربیت اور مشق کے ذریعے حاصل کرسکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اس مہارت کا مطالعہ کریں، آیئے اس لفظ ''حکایت کہنے'' کے معنی پر غور کریں۔ حکایت کہنے کا مطلب ہے کہانی سنانا، کسی واقعے کا بیان کرنا جس میں یہ بتایا جائے کہ کیا ہوا، کیا دیکھا گیا یا کیا سنا، کیا محسوس ہوا اور کیا تجربہ رہا۔ ایک دوسرا لفظ ہے ''بیان کرنا'' جس کے بھی تقریباً یہی معنی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ ان دونوں الفاظ کے مرکزی خیال میں فرق سمجھا جائے۔ کہانی، تجربات وغیرہ کو کہا جاتا ہے (حکایت کہنا) (Narration)، جبکہ واقعہ سنایا یا بیان کیا جاتا ہے (بیان کرنا)۔ سنانے یا بیان کرنے میں صرف حقائق شامل ہوتے ہیں جبکہ کہنے (حکایت) میں جذبات کا عنصر بھی شامل ہے۔ کہنے میں جذبات اور تعلق کا اظہار بھی شامل ہے۔ حکایتی انداز زیادہ تر، کہانیوں کے ذریعے اخلاقی تعلیم دینے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کا استعمال ادب، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کی تدریس میں کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی صاف طور سے سمجھ لینا چاہیے کہ حکایت کہنا (Narration) زبانی بھی ہوسکتا ہے اور تحریری بھی لیکن اس سطح پر ہمارا زیادہ تر تعلق زبانی حکایت کہنے سے ہے۔

حکایت کہنے کی مہارت میں جو سرگرمیاں شامل ہیں، ان میں سے کچھ ہیں: (الف) طالب علم کے لحاظ سے مناسب زبان (ب) حالت کے لحاظ سے مناسب زبان (ج) آواز کا اتار چڑھاؤ (د) اشارات (ہاتھوں وغیرہ کے) (ہ) بیان کی شکل میں تبدیلی (و) حکایت کے بیان میں تسلسل۔ ہم ذیل کے پیراگراف میں ان اجزا پر مختصراً بحث کریں گے۔

(الف) طالب علم کے لحاظ سے موزوں زبان:

اس مہارت میں زبان کی خاص اہمیت ہے۔ حکایت کہنے میں استعمال کی گئی زبان، مطلوبہ طلبہ کے لحاظ سے ہونی چاہیے۔ استعمال کیے گئے الفاظ، محاورے اور جملے وغیرہ میں وہ ادبی خوبی ہونی چاہیے جو پڑھائے جارہے طالب علموں کی مانگ کے مطابق ہو۔ زبان خوبصورت، دلچسپ، سادہ اور رواں ہونی چاہیے۔ اس سے حکایت کہنے کی مناسبت میں اور اضافہ ہوگا۔ بہت چھوٹے بچوں کے لیے، چھوٹے چھوٹے جملے اور بہت سادہ زبان استعمال کرنی چاہیے جس میں وہی الفاظ شامل ہوں جو ان چھوٹے بچوں کے ذخیرۂ الفاظ میں موجود ہوں۔ نوجوان بچوں کے لیے زبان کی کچھ اعلیٰ سطح استعمال کی جاسکتی ہے۔ بیان میں روانی بھی بہت ضروری ہے۔ روانی کی تعریف الفاظ کی ادائیگی کی شرح کے بہ طور کی جاسکتی ہے۔ یہ بہت تیز اور بہت آہستہ نہیں ہونی چاہیے۔

(ب) حالات کے لحاظ سے مناسب زبان:

حکایت کہنے کی مہارت کا سب سے اہم پہلو زبان ہے۔ جن حالات کو بیان کیا جارہا ہے، زبان ان کے لحاظ سے استعمال کی جانی چاہیے۔ استاد کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مزاج، تصور اور جذبات وغیرہ کی ترسیل کی جاسکے، جو ہوسکتا ہے غصہ، محبت، رحم وغیرہ ہوں۔ بدلتے ہوئے مزاج کی عکاسی کرنے کے لیے مختلف قسم کی زبان درکار ہے۔ مثال کے طور پر جنگ یا غصہ کے لیے زوردار، سخت اور کھردری زبان زیادہ مناسب ہے جبکہ محبت اور پیار کے لیے دوسری قسم کی زبان چاہیے۔

(ج) آواز میں اتار چڑھاؤ:

موقعے کی مناسبت سے آواز میں اتار چڑھاؤ لانے سے حکایت کہنے

میں جان پڑ جاتی ہے جبکہ یکساں، سپاٹ آواز کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ نثر پڑھی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر ایسی حکایت جس میں بہت زیادہ جذبات شامل ہوں، اس کے بیان کے لیے اونچی آواز درکار ہوگی۔ جبکہ ایسی حکایت بیان کرنے میں جس میں تکلیف، درد یا دکھ وغیرہ شامل ہوں آواز کو نیچا کرنا پڑے گا۔ آواز جماعت کے سائز کے مطابق بھی ہونی چاہیے۔ بڑی جماعت کے لیے چھوٹی جماعت کے مقابلے میں اونچی آواز کی ضرورت ہوگی۔

(د) اشارے:

حکایت کہنے میں اس وقت جان پڑ جاتی ہے، جب حکایت کہنے والا، جذبات و محسوسات کے پُرزور اظہار کے لیے اشارے، لفظی اور غیر لفظی، دونوں استعمال کرتا ہے جس کے ذریعے، حکایت کہنے والا، اشیا کے ناپ، شکل، نیچے گرنے یا اوپر چڑھنے وغیرہ کے تصور کی نشاندہی کرسکتا ہے۔ اشارے اس تصور سے مطابقت رکھنے والے ہونے چاہئیں۔ جس کی ترسیل کرنی ہے۔ استاد کو لفظی اور غیر لفظی اشاروں کے استعمال میں بہت احتیاط برتنی چاہیے۔ ان سرگرمیوں کا مناسب استعمال، استاد جس تصور کی ترسیل کرنا چاہتا ہے، اس کی ادائیگی میں استاد کی مدد کرے گا اور اس طرح طالب علم زیادہ توجہ دے سکیں گے اور زیادہ دلچسپی لیں گے اور استاد جس زبانی تصویر کی تخلیق کررہا ہے اسے اپنے تصور میں دیکھ سکیں گے۔

(ہ) بیان کی شکل میں تبدیلی:

حکایت کا مواد عام طور سے بیانات پر مشتمل ہوتا ہے جو براہِ راست یا بالواسطہ (Direct or indirect) شکلوں میں ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں حکایت کہنے والے کو براہِ راست انداز استعمال کرنا چاہیے اس لیے کہ یہ بیان اسی شکل میں پیش کیے جانے چاہئیں، جس شکل میں کہانی کے کردار اصلی صورت میں ادا کررہے ہیں۔ بالواسطہ زبان کو براہِ راست زبان میں تبدیل کرنے سے حکایت سنانے والے کو موقعے کے لحاظ سے آواز کے سُر کو اونچا یا نیچے کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس سے حکایت بیان کرنے کی خوبیوں میں اضافہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ حکایت دلچسپ، جاندار اور حقیقی بھی ہوجاتی ہے، اس سے حکایت کہنے والا اپنے تاثرات ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ واقعے میں شامل دوسرے لوگوں کے تاثرات ظاہر کرنے میں بھی کامیاب ہوتا ہے۔

(و) حکایت میں تسلسل:

ایک واقعہ ایک مخصوص سلسلے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک چیز کے بعد دوسری چیز آتی ہے۔ ایک واقعے کی صادق حکایت میں پورا واقعہ اسی منطقی ترتیب دہرایا جانا چاہیے۔

(ii) تحت خوانی کی مہارت (Skill of Recitation)

نظموں، منظوم اقتباسات اور اقوال کی نزاکت کو برتنے کے لیے ابتدائی سطح پر تحت خوانی کی مہارت عام طور سے استعمال ہوتی ہے تاکہ طالب علموں پر حسب منشا اثر پیدا کیا جاسکے۔ حکایت کہنے کی طرح، تحت خوانی کرنے والے کو تحت خوانی میں اپنے خیالات کی آمیزش کرنے کی آزادی نہیں ہوتی۔

تحت خوانی کا مطلب ہے زور (آواز کے ساتھ) سے دہرانا یا یادداشت سے نظمیں، اقتباسات وغیرہ خاص طور سے ناظرین کے سامنے پیش کرنا۔ خوش خوانی یا خطیبانہ انداز (Declamation) تحت خوانی میں شامل ہے۔ خطیبانہ انداز کی تعریف ایسے کی جاتی ہے کہ زور شور کے ساتھ جذبات سے پُر، نہ کہ مدلل تقریر کرنا۔

اس لیے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ تحت خوانی کے عمل میں شامل مشاغل ہیں:

(الف) جو خود یا کسی اور کے ذریعے پہلے کہا یا لکھا جاچکا ہے، اسے دہرانا۔ (ب) اسے بآواز بلند دہرانا (ج) یہ دہرایا جانا، ناظرین کے سامنے ہے۔ یہ واضح طور سے سمجھ لینا چاہیے کہ (الف) ایک اقتباس یا نظم ایک کتاب سے پڑھنا، تحت خوانی نہیں ہے (ب) تحت خوانی صرف پڑھنا نہیں ہے بلکہ مواد مضمون کو یادداشت سے دہرانا ہے۔ تحت خوانی زیادہ پر اثر ہوگی اگر مواد مضمون یاد ہے۔

تحت خوانی میں، تحت خواں کو اپنی طرف سے کسی چیز کی تشریح نہیں کرنی چاہیے۔ جس مواد کی تحت خوانی کی جارہی ہے اس کے ساتھ ساتھ شاعر کے جذبات کا ناظرین کے سامنے اظہار کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے تحت خوانی کا مطلب ہے: جو پہلے لکھا یا کہا جاچکا ہے اسے یادداشت سے بلند آواز کے ساتھ اس طرح دہرانا کہ ناظرین تک مواد میں پوشیدہ جذبات کی ترسیل ہوسکے۔

جب ایک تحت خواں ایک نظم/اقتباس کی تحت خوانی کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اس لیے وہ تحت خوانی سے پہلے، اپنے طالب علموں کو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تیار کرتا ہے جو وہ ان تک پہنچانا چاہتا ہے۔ تحت خوانی کے بعد وہ ان کی تحصیل کا اندازہ قدر مناسب سوالات پوچھ کر کرتا ہے۔

تحت خوانی کی مہارت میں جو سرگرمیاں شامل ہیں، وہ ہیں:

(الف) آواز کا واضح ہونا (ب) درست تلفظ (ج) لے (د) اشارے اور چہرے کا اتار چڑھاؤ (ہ) رفتار (و) روانی۔ انھیں مندرجۂ ذیل پیراگراف میں مختصراً بیان کیا جارہا ہے۔

(الف) آواز کا واضح ہونا:

اس مہارت کی بنیادی ضرورت آواز کا واضح ہونا ہے۔ اس کی کمی سے تحت خوانی کا تصور ہی خراب ہوجائے گا۔ آواز کا واضح ہونا، صاف اور واضح الفاظ کی ادائگی پر منحصر ہے جسے طلبہ یا ناظرین اپنی سماعتی سہولتوں کے ذریعے سمجھ سکیں۔ ناک میں بولنے کی آواز یا منہ ہی منہ میں بولنے سے صرف انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے آواز کا واضح ہونا، تحت خوانی کی مہارت کا لازمی پہلو ہے۔

(ب) درست تلفظ:

غلط تلفظ، مہارت کے پورے اثر کو زائل کردیتا ہے۔ کیونکہ اس سے طلبہ یا ناظرین راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ تحت خوانی کے غلط تلفظ کی وجہ معیاری تلفظ سے ناواقفیت ہوسکتی ہے یا مقامی لہجے کا فرق ہوسکتا ہے۔

تحت خوانی، چھپے ہوئے الفاظ میں جو سرد اور بظاہر زندگی کی حرارت سے عاری معلوم ہوتے ہیں، جان ڈالنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ فطری جذبات کے بغیر کی گئی تحت خوانی بے جان الفاظ کے ایک مجموعے کو دہرائے جانے کا عمل بن جاتی ہے۔ آواز کے مناسب اتار چڑھاؤ اور مناسب توقف کے استعمال سے تحت خوانی کو پُر اثر بنایا جاسکتا ہے۔ پُر اثر تحت خوانی کے لیے لازمی ہے کہ تحت خواں مصنف/شاعر کے جذبات اور ذہن کی کیفیت کے اندر اتر سکے، تب ہی وہ درکار اثر پیدا کرسکے گا۔ غلط جگہ پر توقف، معنی کو بالکل الٹا بھی کرسکتا ہے۔ ایک بہت مشہور مثال ایک چوکی کے آفیسر کی ہدایت: ''روکو، مت جانے دو'' کی ہے، جسے اس کے ساتھی نے سمجھا: ''روکو مت، جانے دو۔''

(ج) لے:

لے وہ میکانکی حرکت ہے جو نظم اور نثر کے لیے اور مختصر، زور دیے گئے اور بے زور والے رکن تہجی، الفاظ اور محاوروں کے ہموار بہاؤ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک موسیقی کی بندش کا وہ پہلو بھی ہے جو موسیقی کے مدوجزر کی دوری ترتیب اور وقفے سے متعلق ہے۔ اس لیے، مواد مضمون کا ہر وہ ٹکڑا، چاہے وہ نثر ہو یا نظم، جو تحت خوانی کے لیے منتخب کیا گیا ہے، اس کی اپنی ایک فطری یا لازمہ ذات لے ہے۔ ہمیں اس کا خیال رکھنا ہوگا کیونکہ یہ مصنف/شاعر کے اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ یہ اس کے جذبات اور خیالات کے اظہار میں مدد کرتی ہے۔ ایک فوجی گیت کی لے ایک دھیمے پُرسوز گیت کی لے سے بالکل مختلف ہوگی۔ اس لیے تحت خواں کو ان الفاظ کا بہ غور مطالعہ کرنا ہوگا اور اسی مناسبت سے ان کی تحت خوانی کرنی ہوگی۔

(د) اشارے اور چہرے کے تاثرات:

تحت خوانی کے ساتھ ساتھ مناسب مقامات پر اشاروں، چہرے کے تاثرات اور جسم کے حصوں کو حرکت دینے سے طالب علموں یا ناظرین پر اچھا تاثر قائم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ استاد کے لیے مواد مضمون میں شامل زبانی تصویر کو طالب علموں کے سامنے ظاہر کرنے کا ایک اچھا ذریعہ بھی ہیں اور طالب علموں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے اور قائم رکھنے میں بھی مدد کرتے ہیں۔ ابتدائی سطح پر اشاروں کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس سطح پر اشاروں کی تکبیر (magnification) کی ضرورت تو ہوتی ہے لیکن ضرورت سے زیادہ مبالغے کی نہیں۔

(ہ) رفتار:

تحت خوانی کی رفتار بھی ایک اہم وجہ ہے جو تحت خوانی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک اچھی تحت خوانی کی رفتار کو مطابقت رکھنا چاہیے: (الف) مواد مضمون سے (ب) ناظرین کے عمر کے گروپ سے (ج) سننے والوں کی سابقہ معلومات سے، تاکہ رفتار، تحت خوانی کی کارکردگی میں اضافہ کرسکے۔ یہ بذات خود مواد مضمون پر بھی منحصر ہے۔ مثال کے طور پر ایک بدیسی زبان کے اقتباس کی تحت خوانی کی رفتار، مادری زبان کے اقتباس کی تحت خوانی کی رفتار سے مختلف ہوگی۔ ایک نئے مواد مضمون کے لیے تحت خوانی کی رفتار دہرائے جارہے مواد کی تحت خوانی کی رفتار سے مختلف ہوگی۔ اس طرح بچوں کے لیے کی جارہی تحت خوانی کی رفتار، بڑے لوگوں کے لیے کی جارہی تحت خوانی کی رفتار سے کم ہوگی، کیونکہ بچے الفاظ کو پہچاننے اور سمجھنے میں، بڑی عمر کے لوگوں کے مقابلے میں، زیادہ وقت لیتے ہیں۔

(و) روانی:

تحت خوانی میں روانی کی وہی اہمیت ہے جو ایک زندہ چیز میں حرکت کی۔ یہ کہے جارہے الفاظ (رکن تہجی) کا لگاتار منظم بہاؤ ہے۔ روانی کی کمی تحت خوانی کے اثر کو کم کردیتی ہے۔ تحت خواں کو مواد مضمون پر پورا عبور ہونا چاہیے اور مواد مضمون کی روح کو تحت خوانی میں سمو کر قدرتی بہاؤ کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔ بھول جانے، زبان لڑکھڑانے یا درمیان میں رک جانے سے تحت خوانی کا پورا تاثر جاتا رہتا ہے۔

□□□

کے. پی. شمس الدین

کیرالا میں اردو

جنوبی ہند میں کیرالا ایک ایسی ریاست ہے جہاں ہندو، مسلم، عیسائی، یہودی سب کی زبان ملیالم ہے۔ سبھی کے لیے یہاں اسی ایک ہی زبان میں اخبار شائع ہوتے ہیں۔ ایسی ریاست میں آج اردو زبان ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

برسوں پہلے کیرالا مالا بار، کوچین، ٹراونکور نام کے تین صوبوں پر مشتمل تھا لیکن تینوں صوبوں کی بولی ملیالم ہی تھی۔ کیرالا میں اردو کی آمد مالابار کے ساحلی علاقوں سے ہوئی۔ سولھویں صدی میں پرتگالیوں کے خلاف جنگ کرنے والے یہاں کے سامودری راجا کی مدد کے لیے بیجاپور کی عادل شاہی حکومت نے اپنی فوج روانہ کی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد وہ لوگ کالی کٹ میں ہی بس گئے۔ ان کی مادری زبان اردو تھی۔ یہیں سے اردو کے چند الفاظ ملیالم زبان میں استعمال ہونے لگے۔ اس دور سے یہاں اردو کا چلن شروع ہوا۔

کیرالا میں اردو کی ترویج و ترقی ٹیپو سلطان کے دور میں ہوئی۔ کیرالا کے بیشتر علاقوں پر ٹیپو کی حکومت تھی۔ اپنی فوج کے لیے سلطان کا جاری کردہ فوجی اخبار اور سلطان کے شاہی فرمان وغیرہ کیرالا میں بھی پہنچتے تھے جو اردو میں ہوتے تھے۔ ٹیپو سلطان کے زیادہ تر فوجی یہیں کے ہو کے رہ گئے اور ان کے ذریعے اردو یہاں پھیلنے لگی یہاں تک کہ ملیالم زبان پر بھی اردو کے اثرات پڑے۔ آج کئی ایسے اردو الفاظ ہیں جو ملیالم زبان کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔

کوچین کے راجا اور ان کے وزرا نے ٹیپو سلطان سے تعلقات بڑھانے اور آپس میں تبادلۂ خیال کرنے کے لیے اردو سیکھنے اور سکھانے کا کام شروع کیا۔ راجا کے تری پونی ترا محل میں اردو کی تعلیم کے لیے ایک کمرے کا الگ سے انتظام کیا گیا تھا جہاں اردو پڑھانے کے لیے ممبئی سے استاد آیا کرتے تھے جنھیں اردو منشی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ 1930 تک جاری رہا۔ اس غیر مسلم راجا کے خاندان کے تقریباً سبھی لوگ اردو سے واقف تھے۔

ٹراونکور میں بھی کچھ اس طرح کے ہی حالات تھے۔ 1760 میں یہاں کے چند اختیارات ارکاٹ کے نواب محمد علی کے پاس تھے۔ ارکاٹ کے نوابوں کا اردو کی ترقی میں جو رول رہا ہے وہ سبھی جانتے ہیں، ٹراونکور کے راجا نے نواب محمد علی کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی سے مراسم بڑھائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی عام لوگوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لیے اردو کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا تھا، اس کا بھی اثر ٹراونکور پر پڑا۔ گویا کہ مختلف مقامات سے مختلف طریقوں سے کیرالا میں اردو کی آمد ہوئی۔

اردو زبان کیرالا میں بول چال کی حد تک تھی اور اس کا دائرہ اتنا وسیع نہ تھا جتنا کہ دوسری ریاستوں میں ہے۔ حیدرآباد کے نظام ٹرسٹ نے کیرالا میں اردو کو عام کرنے اور اردو زبان کی تعلیم کے لیے مالی امداد اور اساتذہ کی فراہمی شروع کی جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ اسی دور میں کیرالا میں اردو شاعری کا آغاز ہوا۔

کیرالا کے واحد مسلم شاہی خاندان سلطنت ارکل، جس کی حکومت کنور میں تھی، حیدرآباد کے نظام سے قریبی مراسم تھے۔ انیسویں صدی میں ارکل سلطان کے دربار میں قوالی اور نعت خوانی کا چلن تھا جس کے لیے حیدرآباد سے شعرا، قوال اور گویئے بلائے جاتے تھے۔ مدراس ریزیڈینسی میں میڈیکل آفیسر کی حیثیت سے نوکری کرنے والے حیدرآباد کے ڈاکٹر نواز کلیم ان قوالوں میں سے تھے جنھیں نظام حیدرآباد ذاتی طور پر قوالی کے لیے دوسرے صوبوں میں بھیجا کرتے تھے۔ نواز کلیم ارکل سلطان کے دربار میں ایک بار قوالی پیش کرنے آئے اور یہیں بس گئے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ 1930 میں تخت نشین ہونے والے ارکل سلطان عبد الرحمٰن علی راجہ موسیقی اور شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان کے دور میں بھی کافی شعرا یہاں آیا کرتے تھے۔ علی راجہ غزل اور قوالی کے عاشق تھے۔ نواز کلیم کے فرزند عبدالقادر کلیم ہندوستانی موسیقی سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھیں شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا۔ ان کا تعلق بھی ارکل دربار سے تھا۔ ان کے بیٹے چاند پاشا نے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، کئی اردو نغموں کو ہندوستانی موسیقی سے سجایا۔ چاند پاشا شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ کیرالا میں اردو کے فروغ میں یہاں کے میمن حضرات کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ کوچین اور تلشیری میں میمن خاندان برسوں سے آباد ہیں۔

بیسویں صدی میں تلشیری سیاست کا گہوارہ تھا۔ اس وقت کے مشہور سیاسی اور سماجی کارکن حاجی عبدالستار اسحٰق سیٹھ نے اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے کافی محنت کی۔ بیسویں صدی میں کیرالا میں اردو زبان و ادب کا فروغ تیزی سے ہونے لگا۔ تلشیری اور کالی کٹ کیرالا کے ایسے مقامات تھے جہاں اردو کے لیے ماحول بہت ہی سازگار رہا۔ تحریک آزادی اور خلافت تحریک نے بھی اردو کی ترویج و ترقی میں بالواسطہ مدد کی تھی۔ شمالی ہند کے نامور سیاسی لیڈروں کا یہاں آنا جانا جاری رہا۔ اکثر لیڈروں کی تقاریر اردو میں ہوا کرتی تھیں۔ اردو کے مشہور صحافی مولانا ظفر علی خاں نے بھی کالی کٹ اور تلشیری کا

دورہ کیا۔ اس دورے پر انھوں نے ''زمیندار'' میں ایک طویل نظم شائع کی جس کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

گر عرب کے نقشِ پا کی شوخیوں کی ہے تلاش
وندھیا چل کو الانگ اور نربدا کے پار چل
نار جیلستاں میں نخلستانِ بطحیٰ کا سماں
دیکھنا ہے گر ان آنکھوں سے تو مالا بار چل

عبدالستار سیٹھ اور ان کے رفقا نے 5/ستمبر 1931 کو تلشیری میں ''انجمن اصلاح اللسان'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ یہاں اردو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ابراہیم سلیمان سیٹھ، موسیٰ ناصح، اسحاق فقیر جیسے لوگ اس انجمن سے وابستہ تھے۔ ابراہیم سلیمان سیٹھ نے اس دور میں کافی نظمیں اور غزلیں لکھیں جو اردو اخباروں میں شائع بھی ہوئیں۔ انھوں نے اپنا تخلص کوثر رکھا تھا۔

موسیٰ ناصح اپنی شاعری اور فصیح زبان سے کافی مشہور ہوئے۔ انھوں نے کئی غزلیں، تہنیت نامے وغیرہ لکھے مگر افسوس کہ ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا اور نہ کسی نے ان کے کلام کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی نظم ''تہنیت'' سے چند اشعار پیش ہیں۔

مبارک ہو یہ شادی خانہ آبادی مبارک ہو
یہ رنگیں عہد و پیمانِ وفاداری مبارک ہو
یہ جشنِ نو عروسی یہ خوشی یہ محفل آرائی
یہ تقریبِ طرب یہ بزم زیبائی مبارک ہو

انجمن اصلاح اللسان کے سکریٹری محمد اسحق نے اردو کو عام کرنے کی بڑی کوشش کی۔ انھی کی کاوشوں سے برسوں پہلے آل کیرالا اردو کنونشن بھی منعقد ہوا تھا۔ محمد اسحق وقتاً فوقتاً شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ ان کا تخلص فقیر تھا۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

اسی غم کی عمر دراز ہو کہ جو سوچتا ہوں بتا سکوں
یہی دور بندہ نواز ہو کہ جو دیکھتا ہوں دکھا سکوں

اپریل 1938 میں تلشیری سے کیرالا کا واحد اردو رسالہ ''نار جیلستان'' جاری ہوا۔ 1940 میں مولوی عبدالحق نے ٹراونکور کا بھی دورہ کیا اور یہاں کے دیوان سر سی۔ پی۔ راما ایئر سوامی سے ملاقات کرکے ٹراونکور یونیورسٹی میں اردو شعبہ قائم کرنے کی درخواست کی۔ موصوف نے اردو شعبہ قائم کرا دیا۔

نار جیلستان کے مالک عبدالکریم سیٹھ اردو کے اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے کئی غزلیں لکھیں جو رسالوں میں بھی شائع ہوئیں۔ ان کا تخلص اختر تھا۔ ان کے دو اشعار پیش ہیں۔

مدتوں سے بڑھ رہا تھا دردِ الفت آپ کا
بڑھتے بڑھتے میرے دل کا یہ بھی ارماں ہوگیا
جل اٹھے داغِ جگر اختر جو سوزِ عشق سے
ذرہ ذرہ میرے دل کا مہرِ تاباں ہوگیا

''نار جیلستان'' کی اشاعت سے کئی شعرا کو اس میں لکھنے کا موقع ملا۔ اس کے مدیر سید ہارون بھی شاعر تھے۔ اس دور کے ایک اور شاعر کوچین کے جانی سیٹھ تھے جن کا تخلص شوق تھا۔ جانی سیٹھ کی پوتی زلیخا حسین کیرالا کی واحد ناول نگار ہیں جنھوں نے ستائیس ناول لکھے۔ جانی سیٹھ سیماب اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ 1938 میں سیماب اکبرآبادی نے کیرالا کا دورہ کیا تو یہاں اردو کی ترقی دیکھ کر بول اٹھے

وسعتیں مل جائیں گی اردو کو اس میدان میں
باثمر ہوگی یہ کوشش نار جیلستان میں

تلشیری میں میمن حضرات کی تعمیر کردہ علی حاجی مسجد بہت مشہور اور پرانی ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں یہاں طاہر محمد موسیٰ عرف بچو سیٹھ کی یاد میں رفاہِ عام کے لیے ایک کنواں کھدوا گیا۔ آج بھی یہ کنواں موجود ہے۔ اس پر بھی اردو میں اشعار کندہ ہیں۔

دعا بہرِ مرحوم بخشش کی مانگیں
یہ بانی کی سب سے گذارش یہی ہے
ہمیں بخشے حق سال مائل اس کا
کیا یاد تو خوب تر بن گئی ہے

تلشیری میں ستار سیٹھ کی سیاسی سرگرمیوں کے دوران نامور شخصیات جیسے نواب صدیق، لیاقت علی خاں، یوسف ہارون، بہادر یار جنگ، مولانا ظفر علی خاں، مولوی عبدالحق، جہاں محمد وغیرہ کالی کٹ اور تلشیری کا دورہ کیا کرتے تھے اور ستار سیٹھ کے بنگلے پر قیام کرتے تھے۔ عموماً عشائیہ کے بعد مشاعرے کا انعقاد بھی ہوا کرتا تھا۔ ان مشاعروں میں کیرالا اور بیرونی ریاستوں کے شعرا بھی شریک ہوتے تھے۔ ریاست کیرالا میں مشاعروں کی شروعات یہیں سے ہوئی۔ اس زمانے میں تلشیری میں ایک شاعرہ بھی رہا کرتی تھیں جن کا نام عائشہ اور تخلص حیا تھا۔ شادی کے بعد اہلِ خاندان کے ساتھ ترونند پورم چلی گئیں۔

عائشہ حیا کی قریبی سہیلی محمودہ میں بھی عائشہ کی قربت کی وجہ سے شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ وہ لاہور سے شائع ہونے والے ''تہذیب النسا'' اور دیگر کئی رسالوں میں انگریزی نظموں کا ترجمہ کرکے شائع کرواتی تھیں۔ چوراسی سالہ محمودہ ابراہیم سلیمان سیٹھ کی خالہ زاد بہن ہیں۔ فی الوقت میسور میں مقیم ہیں۔

ایک زمانے میں ترونند پورم میں اردو کا بول بالا تھا۔ وہاں کے راجا اور آرکاٹ کے نوابوں کے درمیان قریبی تعلقات تھے۔ گمنامی کے اندھیروں

میں کھونے والے ترونند پورم کے شعرا میں صرف عبدالحمید کے متعلق چند حقائق ملتے ہیں۔ عبدالحمید کا تخلص قریش تھا۔ نعتیہ شاعری میں قریش کا اپنا ایک الگ مقام تھا۔ ان کے اشعار ہیں۔

قریش نے کئی مرثیے بھی لکھے ہیں۔ 1988 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

7/نومبر 1943 کو کالی کٹ کے ٹاؤن ہال میں محبانِ اردو کی جانب سے اردو کانفرنس اور مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کا افتتاح مولوی عبدالحق نے کیا۔ کانفرنس میں انجمن ترقی اردو کی مالا بار شاخ قائم کی گئی۔ کانفرنس کے بعد حمایت اسلام ہال میں مشاعرہ ہوا جس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے علاوہ مدراس محمڈن کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عبدالحق، محوی، اسرار اور شبر کے علاوہ بنگلور اور میسور کے شعرا بھی موجود تھے۔ کیرالا کے شاعر سید محمد سرور نے دونوں عبدالحق صاحبان کے استقبال میں چند اشعار پیش کیے۔

ہند کے ہر فرد کو باہم ملانے کے لیے
گلشنِ اردو کے محسن باغباں آہی گئے
دونوں حق، محوی و اسرار اور شبر آئے ہیں
یعنی اردو کے یہ سب روحِ رواں آہی گئے

مشاعرے میں مولوی عبدالحق صاحب کو ہی لوگوں نے میرِ مشاعرہ بنایا اور شبر کا ان سے شعر بھی پڑھوایا

گو پیر ہیں پہ دل سے ہمیشہ جواں رہے
گل کی طرح شگفتہ رہے ہم جہاں رہے

اسی اردو کانفرنس میں انجمن ترقی اردو کی مالا بار شاخ قائم کی گئی۔ صدر حاجی اسحٰق عبدالستار سیٹھ کو، سکریٹری مقبول احمد کو اور خازن باقفیہ ٹھنگل کو منتخب کیا گیا۔ انجمن کے زیرِ نگرانی کئی جگہ اردو کلاسوں کی شروعات ہوئی اور پیشہ وروں کے لیے شبینہ کلاسیں بھی شروع کی گئیں۔ اس طرح اردو بہ تدریج ترقی کی راہ پر گامزن رہی۔

1947 میں ملک کے آزاد ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان کی تقسیم بھی عمل میں آئی جس کی زد اردو پر بھی پڑی۔ کچھ مدت تک تو صورتِ حال یہ رہی کہ اگر کوئی اردو کا نام بھی لیتا تو اسے شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ ایسے دور میں ایس.ایم.سرور، ولا پٹنم عبداللہ، اسحاق محمد فقیر جیسے لوگوں نے کیرالا میں اردو کی بحالی کے لیے کافی جدوجہد کی جس کے مثبت نتائج بھی نکلے اور اردو دوبارہ آہستہ آہستہ پھیلنے لگی۔

ایس.ایم.سرور، جن کے دو شعری مجموعے ''ارمغانِ کیرالا'' اور ''نوائے سرور'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، نے اس دور میں اپنی شاعری سے اردو دنیا کی توجہ کیرالا کی طرف دلائی۔ سرور کہتے ہیں۔

ہند کی انگشتری کا ہے نگینہ کیرالا
ہے کئی اشیائے نادر کا خزینہ کیرالا
تم کہو کشمیر کو فردوس بر روئے زمیں
میں کہوں ہے کیرالا فردوس سے بڑھ کر کہیں

اترپردیش اردو اکادمی نے سرور کو اعزاز اور سند سے بھی نوازا۔ سرور کے شعری مجموعوں کے مطالعے کے بعد محوی صدیقی، ارشد صدیقی، ساغر مہدی، سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر محمد کمال الدین، عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر صفدر آہ، مخمور سعیدی، فہیم حنفی جیسی شخصیتوں نے کافی ستائش کی ہے۔ ممتاز نقاد شارب ردولوی نے انھیں کیرالا کا بابائے اردو قرار دیا۔

سرور کا تعلق ضلع ملاپورم سے تھا۔ اس ضلعے کے مشہور گاؤں ترور میں سید نورالدین ایک شاعر گزرے ہیں۔ نورالدین کاروباری آدمی تھے۔ وہ عشقیہ شعر کہا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنا تخلص بے چین کیرلوی رکھا تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں انھوں نے نظمیں، غزلیں وغیرہ لکھیں۔ بدقسمتی سے ایک حادثے میں اپنا تمام کلام کھو بیٹھے۔ اردو کی مخالفت کرنے والوں سے بے چین کیرلوی کہتے ہیں۔

مٹانے والوں سے کہہ دو کہ مٹ گئے لاکھوں
زبان اردو مٹانا کوئی مذاق نہیں

کیرالا کے موجودہ شاعروں میں جناب این.محی الدین کٹی اہم ہیں جن کا تخلص محروم ہے۔ محی الدین کٹی کی نظمیں اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کیرالا کی درسی کتابوں میں بھی ان کی نظمیں شامل ہیں۔ محی الدین کٹی اور حمید کاراشیری نے بچوں کے لیے نظموں کا مجموعہ ''پیاری پیاری نظمیں'' مرتب کیا ہے۔ دو حصوں پر مشتمل اس مجموعے کے ایک حصے میں منتخب شدہ نظمیں اور دوسرے حصے میں مذکورہ دونوں شعرا کی نظمیں ہیں۔ حال ہی میں کالی کٹ سے کے.ٹی.عبدالرشید نے بچوں کے لیے منتخب شدہ نظموں کا مجموعہ ''پھلواری'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ کیرالا کے دیگر موجودہ شعرا میں عبدالرحمٰن کنتیل، عبدالرحمٰن آواز اہم ہیں۔ عبدالرحمٰن آواز کی دو نظمیں ''جوانی'' اور ''سمندر'' کافی مشہور ہیں۔

نوجوان شاعروں میں فیصل زعیم بھی اپنی شاعری کا کمال دکھا رہے ہیں۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے ''طفلِ بہار''، ''طلوعِ حرکت'' اور ''شعلہ'' شائع ہو چکے ہیں۔

کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے ترجمان سہ ماہی ''اردو بلیٹن'' میں کیرالا کے شعرا کا کلام پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ فاروق کالج (کالی کٹ) کے سابق صدر شعبۂ اردو جناب قدرت اللہ ثاقب، سرسید کالج (تلی پرمبا) کے صدر شعبۂ اردو یعقوب شریف نادر اور تلشیری برنن کالج کے سابق صدر شعبۂ اردو میر احمد علی خورشید وغیرہ بھی مشہور شاعر ہیں۔ راقم السطور نے بھی اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔

1970-72 کے دوران میں اسکولوں میں (مع سرکاری اسکول) اردو کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ یہ انتظام اس وقت کے وزیرِ تعلیم سی۔ایچ محمد کویا اور ایک دوسرے وزیر احمد کُری کلّ کی کوششوں سے ہوا۔ 1974 میں کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن قائم کی گئی۔ یہ انجمن مسلسل اردو کی ترقی کے لیے کوشاں ہے اور اردو اساتذہ کو سرکار سے ان کا حق دلوانے میں بھی پیش پیش ہے۔

8/ستمبر 1991 کو انجمن ترقی اردو، کیرالا کی تشکیلِ نو ہوئی۔ جناب عبدالصمد صمدانی کو اس کا صدر اور جناب پی عبدالغفور کو سکریٹری چنا گیا۔ کیرالا میں اردو کو عام کرنے میں صمدانی صاحب کا اہم رول رہا ہے۔ عبدالصمد صمدانی صاحب اپنی تقریروں میں علامہ اقبال کے اشعار حسبِ موقع استعمال کیا کرتے ہیں جس سے اردو اور اقبال سے ناواقف لوگوں میں بھی اقبال سے روشناس ہونے اور اردو زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ اردو شاعری میں ریاست کیرالا کا بھی حصہ رہا ہے لیکن اس کی تاریخ اتنی وقیع نہیں جتنی کہ دوسری ریاستوں میں ہے۔ کیرالا کی عام بولی ملیالم ہے۔ یہاں اردو کسی کی مادری زبان نہیں ہے۔ پھر بھی اردو کا ذوق وشوق اور شعروشاعری کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ کیرالا میں اردو کی ترویج دیکھ کر جلال کڑپوی نے برسوں پہلے کہا تھا۔

اردو کی کیرالا میں تشہیر ہو رہی ہے
قصر ادب کی گویا تعمیر ہو رہی ہے

جناب عبدالصمد صمدانی 1993 میں راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے جس سے کیرالا میں اردو کے کاز کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ انھوں نے پارلیمنٹ میں اردو میں حلف لے کر روزمرّہ زندگی میں ہر مقام پر اردو کے استعمال کا درس دیا۔ صمدانی صاحب نے علامہ اقبال انڈین ہیومینٹرین فاؤنڈیشن (Allama Iqbal Indian Humanitarian Foundation) قائم کی۔ اسی دوران میں کیرالا میں قومی اردو کونسل کے پروگراموں کی آمد ہوئی۔

قومی اردو کونسل یوں تو ہندوستان بھر میں اردو کی ترویج وترقی کے لیے نمایاں رول ادا کررہی ہے لیکن کیرالا میں اس کی آمد اس لیے زیادہ اہم ہے کہ جنوبی ہند میں یہ اردو کا ایک قدیم گہوارہ ہے۔

کالی کٹ میں اردو پرچار سمیتی کاسرکوڈ میں سعدیہ کالج اور ترونند پورم میں ہندی پرچار سبھا میں قومی اردو کونسل نے کمپیوٹر سینٹر قائم کیے ہیں جہاں سے کئی لوگ اردو ڈی۔ٹی۔پی۔ سیکھ کر خدمتِ اردو میں لگے ہوئے ہیں۔ کالی کٹ کے مرکز میں کونسل نے اپنا بک اسٹال ''اردو بک سینٹر'' کے نام سے قائم کیا ہے۔ یہ کیرالا کی واحد کتاب کی دکان ہے جہاں صرف اور صرف اردو کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ اس سے یہاں کے اردو اساتذہ، طلبہ اور عام اردو دانوں کو بے حد فائدہ پہنچا ہے۔ سرکاری اسکول، کالج اور ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ بھی اپنی لائبریری کے لیے اردو کتابیں یہیں سے خریدتے ہیں۔

گذشتہ سال کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے کالی کٹ میں منعقدہ سالانہ اجلاس میں راجیہ سبھا کے رکن اور انجمن ترقی اردو کیرالا کے صدر جناب عبدالصمد صمدانی کی خصوصی دعوت پر اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ یہاں تشریف لائے تھے۔ ایئرپورٹ سے کالی کٹ کے سفر کے دوران ان سے خاکسار سے کیرالا میں اردو کے حالات پر گفتگو ہوئی۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ کیرالا کے اردو اساتذہ میں چالیس فی صد غیر مسلم ہیں تو انھوں نے اپنی دلی مسرّت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی ساری ریاستوں میں اسی طرح ہونا چاہیے۔ اردو کسی ایک فرقے یا کسی ایک مذہب کی زبان نہیں ہے۔ یہ تمام ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ یہ کیرالا کے اردو عوام کی خوش قسمتی ہے کہ قومی اردو کونسل اردو سے متعلق تمام سرگرمیوں میں ہر ممکن تعاون دیتی ہے۔ سیمیناروں کا انعقاد ہو یا کتب خانوں میں مفت اردو کتابوں کی فراہمی، اردو کونسل پوری مدد کرتی ہے۔

تلشیری میں کچھ دنوں پہلے اردو کونسل کے تعاون سے دوروزہ قومی اردو سیمینار منعقد کیا گیا۔ کانفرنس کے بعد کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن اور انجمن ترقی اردو (کیرالا) کے کارکنان نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر پہنچ کر ڈائرکٹر صاحب سے ملاقات کی اور ان اسکولوں کی پہلی فہرست پیش کی جہاں پچاس سے زائد اردو پڑھنے والے طلبہ موجود ہیں۔ انھوں نے اسی وقت ان اسکولوں کے کتب خانوں کے لیے مفت اردو کتابیں بھیجنے کی کارروائی شروع کردی اور چند دن بعد کتابیں کیرالا پہنچ گئیں۔

قومی اردو کونسل نے ''کیرالا اردو پرچار سمیتی'' کے ماتحت کڈامیری (کالی کٹ)، کالی کٹ سٹی، چینامنگلور (کالی کٹ)، ایڈاوتا (ملاپُرم)، کاڈنور (ملاپُرم)، ملاپُرم سٹی (ملاپُرم)، کٹیاڈی (کالی کٹ)، ترورکاڈ (ملاپُرم) میں کمپیوٹر سینٹر قائم کیے ہیں۔ اس کے علاوہ معونت الاسلام عربک کالج (پونانی)، جامعہ سعدیہ عربیہ (کاسرگوڈ)، مرکز ثقافت سنیہ (کارنتور) مدینۃ النور کالج (پونور)، مدینہ ثقافت السلامیہ (میل سری)، دعوت السلامیہ (اری کوڈ) میں بھی کونسل کی سرگرمیاں جاری ہیں۔

کیرالا میں اردو کی ترویج وترقی میں اردو کونسل جو دلچسپی لے رہی ہے وہ بلاشبہ قابل تعریف ہے۔ مستقبل میں جب بھی کیرالا میں اردو زبان و ادب کی تاریخ لکھی جائے گی تو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا نام سنہرے الفاظ میں آئے گا۔

Urdu Teacher
A.M. High School, P.O. Tirurkad,
Malappuram (Dist.) Kerala-679351

□□□

رحمت یوسف زئی

کمپیوٹر اور فن خطاطی

اردو کی شناخت نستعلیق رسم الخط سے ہے اور اس خط کی سب سے اہم خصوصیت خوبصورتی اور دیدہ زیبی ہے۔ اس خط کو دیکھ کر ہی احساسِ جمال بیدار ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو والوں نے شدید مخالفت کے باوجود اس رسم الخط کو سینے سے لگائے رکھا۔ حیرت ہے کہ ایران جہاں اس رسم الخط نے جنم لیا، وہیں اسے ترک کردیا گیا اب وہاں تقریباً سارا طباعتی کام نسخ میں ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس خط کے موجد خواجہ میر علی تبریزی ہیں جنھوں نے نسخ اور تعلیق کی آمیزش سے ایک نیا خط روشناس کرایا۔ لیکن ابوالفضل نے تبریزی کی اولیت سے انکار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے امیر تیمور کے قبل کے زمانے کی وصلیاں دیکھی ہیں جو نستعلیق میں تھیں۔ بہر حال محققین اس بات سے تو متفق ہیں کہ تبریزی نے اس خط کو خوبصورت سے خوبصورت تر بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ایک بات تو طے ہے کہ یہ خط ایرانی مسلمانوں کی دین ہے۔ نستعلیق میں ایک مصورانہ شان ملتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اسلام نے انسانوں اور دیگر جانداروں کی تصویریں بنانے سے منع کیا کیوں کہ اس سے بت پرستی یا تصویر پرستی کو شہہ مل سکتی تھی۔ لیکن انسانی ذہن بہر حال فن کا شائق ہوتا ہے۔ اسی لیے تصویروں کی بجائے مسلمانوں نے دوسرے میدانوں میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو ظاہر کیا جیسے شعر و ادب، فنِ تعمیر، موسیقی، خطاطی وغیرہ۔ فنِ خطاطی میں ماہرین نے ایسے ایسے شاہ کار تخلیق کیے کہ دیکھتے ہی بنے۔ یہ دراصل ان کی مصورانہ صلاحیتوں کا نتیجہ تھا۔

اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ خطاطی کا ذہنی پس منظر مصوری ہے اور اسی لیے اس رسم الخط میں حسن کاری سب سے نمایاں عنصر ہے۔ اردو کا مزاج بھی جمالیاتی ذوق کا پروردہ ہے اور شاید اسی لیے اردو والوں نے اس رسم الخط کو اپنایا اور اس طرح اپنایا کہ آج یہ خط اردو کی شناخت بن چکا ہے۔

بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں سائنسی ترقیوں نے بڑی تیزی سے انسانی سماج کو متاثر کیا۔ الیکٹرانک انقلاب نے گویا انسانی فکر کو پر لگا دیے۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو سب سے بڑی مصیبت اردو پر نازل ہوئی۔ اسے صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے کر ملک بدر کرنے کی سازشیں ہوئیں۔ سازش کو کامیاب بنانے کے لیے اس خیال کو عام کرنے کی کوشش کی گئی کہ اردو کا رسم الخط بہت پیچیدہ ہے اور جب تک اردو والے اپنے رسم الخط کو نہیں بدلیں گے، ترقی یافتہ اقوام کی دوڑ میں پیچھے رہیں گے۔ چنانچہ چند اہم دانشوروں نے دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ کچھ نے رومن رسم الخط اپنانے کی بات کی۔ لیکن اردو والوں نے کسی کی نہیں مانی۔ اردو ٹائپ تیار ہونے کے بعد بھی کچھ اسی طرح کی باتیں کی گئی تھیں۔ اردو ٹائپ میں طبع شدہ کتابیں پڑھنے سے لوگ کتراتے رہے۔ وہ ملک جو اردو کے نام پر بنا تھا وہاں بھی نستعلیق کو ملک بدر کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ میں بے حد معذرت کے ساتھ ایک بات کہنے کی جسارت کروں گا کہ اس کے ذمے دار اردو کے کاتب تھے جن کی وعدہ خلافی، غلطیوں کی بھرمار اور خط کی ناپختگی اکثر لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ ٹائپ ہی اس مسئلے کا حل ہے۔ دشواری یہ تھی کہ ٹائپ میں نسخ ہی استعمال ہوتا ہے اور اس تحریر کو روانی سے پڑھنا نسبتاً دشوار محسوس ہوتا ہے کیوں کہ اردو والوں کی آنکھیں نستعلیق کی عادی ہیں۔ مجبوراً اردو والوں نے ٹائپ کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان سے چھپنے والی بیشتر کتابیں ٹائپ میں شائع ہوئیں۔

لیکن الیکٹرانک انقلاب نے اردو کو بھی نئی راہ دکھائی۔ ویسے ابتدا میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ نستعلیق کے لیے کمپیوٹر شاید کارآمد ثابت نہ ہو کیوں کہ یہاں ہر حرف کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ حرف کی نشست بھی مختلف مقامات پر مختلف ہوتی ہے۔ یہ دشواریاں ایسی تھیں کہ ایک عرصے تک کمپیوٹر اردو رسم الخط کے قریب نہ آسکا جب کہ نسخ نے اسے بڑی آسانی سے اپنا لیا۔ پٹرو ڈالر کی قوت نے مائکروسافٹ کو اس بات پر راغب کر لیا کہ ڈاس (Dos) یعنی ڈسک آپریٹنگ سسٹم کے ذریعے نسخ رسم الخط میں تحریری کام کیا جاسکے۔

بیسویں صدی کے آخری ربع میں کچھ ایسی ایجادات سامنے آئیں جن سے نستعلیق کو بے حد فائدہ پہنچا۔ 1979 میں انٹرنیشنل بزنس مشینز (آئی بی ایم) نامی کمپنی نے لیزر ٹائپ سیٹنگ پرنٹر روشناس کرایا جس کی خوبی یہ تھی کہ پلاٹر کے ذریعے تیار کی جانے والی گرافکس کو لیزر تصویری تکنیک سے نہ صرف کاغذ پر پیش کیا جاسکتا تھا بلکہ اسے ٹیپ فلاپی وغیرہ پر محفوظ بھی کیا جاسکتا تھا۔ جب اس پرنٹر کے بارے میں پاکستان میں پرنٹنگ سے وابستہ مرزا جمیل احمد کو معلوم

ہوا تو ان کے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا۔ انھوں نے سوچا کہ گرافکس کے ذریعے اردو کی مختلف شکلوں کو یا یوں کہیے کہ جوڑوں کو محفوظ کرلیا جائے تو ایک ڈیٹا بیس تیار ہوسکتا ہے اور کلیدی تختے یعنی کی۔ بورڈ کے ذریعے ان حروف کا مخصوص جوڑ حاصل کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ انھوں نے روز نامہ ''جنگ'' کے تعاون سے اس کام کو آگے بڑھایا اور اردو میں استعمال ہونے والے ممکنہ الفاظ کو توڑ کر الگ الگ شکلیں (Ligatures) تیار کیں اور اس طرح کمپیوٹر کے ذریعے نستعلیق بھی ممکن ہوگیا۔

اس طریقۂ کار میں ایک دشواری تھی۔ کمپیوٹر صرف انھی الفاظ کو نستعلیق میں پیش کرتا تھا جن کی شکلیں کمپیوٹر میں پہلے سے موجود ہوں۔ کوئی ایسا لفظ جس کی شکل پہلے سے موجود نہ ہو، کمپیوٹر پیش کرنے سے قاصر تھا۔ اس دشواری پر قابو پانے کے لیے یہ ترکیب کی گئی کہ ایسے موقعوں پر کمپیوٹر نسخ استعمال کرلے۔ چنانچہ اس زمانے میں پاکستان سے چھپنے والے اخبارات اور رسائل میں کہیں کہیں نسخ میں لکھے گئے الفاظ نظر آتے تھے۔

اس ضمن میں ہندوستان کے ایک کمپیوٹر کے ماہر نوجوان اشہر فرحان نے اپنے ایک دوست جاوید کے ساتھ نستعلیق میں استعمال ہونے والے حروف کے جوڑ تیار کرنے کے اصول مرتب کیے اور ان قواعد کو کمپیوٹر میں داخل کرکے نستعلیق میں کتابت کرنے کی راہ ہموار کی۔ روز نامہ ''سیاست'' نے اس کو سب سے پہلے اپنایا۔ چنانچہ ہندوستان میں کمپیوٹر کے ذریعے نستعلیق کتابت میں شائع ہونے والا پہلا اخبار ''سیاست'' ہی ہے جس کا پہلا کمپیوٹر کتابت سے آراستہ شمارہ 15 اگست 1988 کو شائع ہوا۔

ابتدا میں اس اخبار میں دو کالم کمپیوٹر کے ہوا کرتے تھے لیکن دو ماہ کے عرصے میں اخبار کے ایڈیٹر عابد علی خاں مرحوم نے چند نوجوانوں کو کمپیوٹر آپریٹنگ سکھانے کا اہتمام کیا اور پھر پورے اخبار کی کتابت کمپیوٹر کے ذریعے ہونے لگی۔ ابتدائی کمپیوٹر پروگرام میں کچھ خرابیاں بھی تھیں جیسے کچھ جوڑ دیدہ زیب نہ تھے، کئی جگہوں پر نقطوں کی نشست درست نہ تھی۔ کبھی نقطے خلط ملط ہو جایا کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ان دشواریوں پر بھی قابو پالیا گیا۔

اگر اشہر فرحان نے اس طرح کا کام کسی اور زبان کے لیے کیا ہوتا تو ان پر دولت کی بوچھار ہوسکتی تھی لیکن اردو ہمیشہ ہی افلاس کا شکار رہی ہے۔ بہر حال فرحان نے اردو والوں کو ایک ایسا تحفہ دے دیا جس کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ اردو کی تاریخ میں تابناک رہے گا۔ قارئین کی اطلاع کے لیے عرض کردوں کہ فرحان کا تیار کردہ اردو سافٹ ویر آپ جب چاہیں اور جہاں چاہیں، کمپیوٹر کے ذریعے مفت ڈاؤن لوڈ کرکے استعمال کرسکتے ہیں۔ فرحان کی دریا دلی اور اردو سے محبت کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا ہوگا؟

دہلی کے دو نوجوانوں آر پی سنگھ اور وجے کرشن گپتا نے مرزا جمیل کے تیار کردہ نوری نستعلیق کے حقوق ہندوستان کے لیے حاصل کرکے ایک نیا پیکیج ان پیج کے نام سے تیار کیا۔ اس نظام میں بائیس ہزار سے زیادہ اشکال رکھے گئے ہیں۔ ان اشکال کے ذخیرے کو آپ بھی چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں۔ صرف آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ ان پیج کے فونٹ کی فائل کھول لیں جو نوری کے نام سے ہی ہے۔ ان فائیلوں میں مختلف جوڑ کی شکلیں محفوظ کرلی گئی ہیں، جو بوقت ضرورت استعمال کی جاسکتی ہیں۔

یہ تو دستی کتابت سے کمپیوٹر کتابت کے سفر کی داستان تھی۔ آج اگر آپ غور کریں تو محسوس ہوگا کہ اخبارات اور رسائل تو خیر کمپیوٹر پر چھپتے ہی ہیں، کتابیں بھی کمپیوٹر کتابت سے آراستہ ہونے لگی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ دستی کتابت کا دور ختم سا ہوگیا ہے۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو حسن خطاطی میں ہے وہ کمپیوٹر میں کبھی نہیں آسکتا۔ میں یہاں کاتب اور خطاط میں فرق کرنے کی جسارت کررہا ہوں۔ کاتبوں کی وجہ ہی سے اردو کتابت کی کشتی ڈوب رہی ہے۔ دراصل خطاط صرف کاتب نہیں ہوتا۔ خطاط وہی ہے جو جمالیاتی احساس سے متصف ہو اور جب وہ حسن کاری سے کام لیتا ہے تو شاہکار وجود میں آتے ہیں، ایسے شاہکار جن تک کمپیوٹر کی بھی رسائی نہیں ہوسکتی۔ اس کی مثال یوں ہے کہ کمپیوٹر پر تصویریں بنائی تو جاسکتی ہیں، ان میں رنگ بھی بھرے جاسکتے ہیں اور پھر ان تصویروں کی ہزاروں کاپیاں بھی بنانا ممکن ہے لیکن ایک آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر اور کمپیوٹر کے ذریعے بنائی گئی تصویر کی قدر و قیمت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وجہ صاف ہے۔ آرٹسٹ کی بنائی گئی تصویر میں اس کا اپنا احساس بھی جگمگاتا ہے۔ اس کی قوت اظہار رنگوں کو نئی معنویت عطا کرتی ہے۔ اس کے بنائے گئے خطوط میں جمالیاتی ورک نمایاں ہوتا ہے۔ کمپیوٹر ان لطیف خصوصیات سے عاری ہوتا ہے۔ آرٹسٹ کی تیار کردہ تصویر کا صرف ایک ہی نمونہ ہوگا جب کہ کمپیوٹر پر تیار کی گئی تصویر کی جتنی نقلیں آپ چاہیں حاصل کرسکتے ہیں۔ یہی حال خطاطی کا بھی ہے۔ عام کتابت سے ہٹ کر فن کے میدان میں خطاطی کے عمدہ نمونے صرف انسانی ذہن ہی پیش کرسکتا ہے بشرطیکہ خطاط میں فن کارانہ صلاحیتیں موجود ہوں، اس کی جمالیاتی حس تیز ہو اور وہ اپنے احساس کو کاغذ پر منتقل کرنے پر قادر ہو۔

اس موقعے پر مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ شاید تیس برس پرانی بات ہے: میں نے حیدرآباد کے ایک نامور اور ماہر خطاط سلام خوشنویس سے ایک

کارڈ لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنا تھا اور میں چاہتا تھا کہ یہ تحریر یادگار بن جائے۔ سلام صاحب نے رات گیارہ بجے لکھنا شروع کیا۔ تقریباً پچاس بار انھوں نے صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا اور یہ کہہ کر پھاڑ دیا کہ جی کو نہیں لگتا۔ صبح تقریباً پانچ بجے انھوں نے کام ختم کیا اور ایسے لکھا کہ باید و شاید۔

عرض مدعا یہ ہے کہ خطاط کاتب نہیں ہے وہ تو فنکار ہے اور اپنے فن کے جادو سے زمانے کو زیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس فن کو ان لوگوں نے بدنام کر دیا جو قلم کو صحیح طریقے سے پکڑنا بھی نہیں جانتے اور کاتب بن بیٹھے ہیں۔ یہ روزی روٹی کا ذریعہ تو بن گیا لیکن جمالیاتی حس کے فقدان کی وجہ سے وہ جہاں تھے، وہیں رہے۔ بالآخر کمپیوٹر نے ان کی روزی بھی ختم کر دی۔ لیکن جو ماہرینِ فن ہیں ان کی قدر جوں کی توں ہے۔ لوگ آج بھی ان کی تحریر کے شیدائی ہیں۔ ان کا نام آج بھی احترام سے لیا جاتا ہے۔

حیدرآباد ہمیشہ سے خطاطی کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ایسے ایسے نامور خطاط تھے اور ہیں جن کی تحریر آنکھوں سے لگائی جاتی ہے۔ یہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے فن کے لیے زندگی صرف کر دی۔ حیدرآباد میں خطاطی کی تربیت کا بھی اہتمام ہے اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اعانت سے ادارۂ ادبیات اردو میں ایک مرکز قائم کیا گیا ہے جہاں ہر سال کئی طلبہ و طالبات خطاطی کا فن سیکھتے ہیں۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی، روزنامہ "سیاست" اور ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام اردو کمپیوٹر سکھانے کا بھی انتظام ہے۔ بظاہر یہ دو چیزیں ایک دوسرے کی ضد لگتی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ کمپیوٹر کے ذریعے اردو کتابت کرنے والا اگر خطاطی کے فن سے واقف ہو تو اس کے لیے اپنی کتابت میں حسن پیدا کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ تزئینی خط کے لیے وہ کورل ڈرا کا استعمال کر کے حسن کو دوبالا کر سکتا ہے۔ خطاطی سے ناواقف آپریٹر اگر کمپیوٹر پر "بخشش" لکھے تو دونوں 'ش' دندانے دار ہوں گے یا دونوں کشش کے ساتھ ہوں گے۔ لیکن خطاط صرف ایک ش کو کشش سے لکھے گا۔ ان پیج میں ایک سہولت یہ ہے کہ آپ اگر چاہیں تو کسی ٹکڑے کو منتخب کر کے اوپر نیچے دائیں بائیں ہٹا سکتے ہیں تاکہ حسن پیدا ہو۔ معمولی آپریٹر اگر یہ عمل کرے تو بجائے حسن کے بدصورتی پیدا ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کاتب خطاطی کے فن سے واقف ہو تو پھر وہ لفظ کی ساخت کے اعتبار سے اس طرح ہٹائے گا کہ تحریر زیادہ حسین لگے۔ کورل ڈرا کی مدد سے ایک کمپیوٹر کا ماہر طغرا بھی تیار کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ خطاطی کے فن میں بھی ماہر ہو۔ لیکن عام آپریٹر اگر طغرا بنائے گا تو وہ طغرے کی بجائے مقبرہ بن جائے گا۔

ایک اور بات، کمپیوٹر کی کتابت آنکھوں کو قدرے کھلتی ہے۔ مثال کے طور پر خطاط جب الف لکھتا ہے تو مختلف مقامات پر اس کی لمبائی میں قدرے فرق رکھتا ہے تاکہ متصل لفظ کے ساتھ وہ خوبصورت دکھائی دے۔ اس کی شکل ہمیشہ سیدھی نہیں ہوتی بلکہ متصل لفظ کی مناسبت سے وہ ایک طرف قدرے جھک جاتا ہے۔ دو حروف اور دو الفاظ کے درمیان یکساں فاصلہ نہیں ہوتا اور خطاط ساخت و مفہوم کے اعتبار سے فاصلہ کم یا زیادہ کر لیتا ہے تاکہ تحریر کا حسن بڑھ جائے۔ جب کہ کمپیوٹر میں یہ کام قدرے مشکل ہے۔ یہاں حروف کے درمیان فاصلہ متعین ہے۔ الف ہر جگہ ایک ہی شکل اور ایک ہی سائز کا ہوتا ہے۔ اس لیے یکسانیت میں ایک طرح کی اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ نفاست تو بہر حال ہوتی ہے لیکن حسن اور لطف نہیں ہوتا۔ ادارۂ ادبیات اردو میں خطاطی کے استاد عبدالغفار صاحب نے بڑی اچھی بات کہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ دورِ حاضر میں میز کرسی پر بیٹھ کر چمچے سے کھانا نفاست ہے لیکن انگلی چوسنے میں جو لذت ہے وہ چمچہ چوسنے میں ہرگز نہیں آ سکتی۔ بات بالکل صحیح ہے۔ اور اسی تناظر میں کمپیوٹر کی تحریر میں نفاست تو ہو سکتی ہے لیکن حسن کم ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ کمپیوٹر کی تحریر میں متعینہ قانون ہے جس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ ایک بار میں نے کوشش کی کہ حرف "بے" کے جوڑوں کی گنتی کروں۔ تقریباً تیرہ جوڑ ملے۔ لیکن یہ ایک سرسری جائزے کا نتیجہ تھا۔ ان جوڑوں کے علاوہ متصلہ حرف کی ساخت کے اعتبار سے بھی ب کی نشست اوپر نیچے ہو سکتی ہے گویا ایک متعین قانون کسی حرف کے لیے بنانا مشکل ہے۔ متعین قانون سے یکسانیت تو ہوگی لیکن حسن مفقود ہو جائے گا۔ لوگ سوچتے ہیں کہ اب خطاطی ایک مردہ فن بن جائے گا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ایران میں عوامی سطح پر نسخ کی چھپائی کو اپنا لیا گیا لیکن جلسے جلوسوں میں جو بینر ہوتے ہیں وہ آج بھی نستعلیق میں ہیں اور یقیناً انھیں کسی خطاط نے لکھا ہوگا۔ دراصل کمپیوٹر کی تحریر آنکھوں کے ذریعے دماغ تک پہنچتی ہے لیکن خطاطی کے فن سے آراستہ تحریر آنکھوں کو ایک سرور دیتی ہے اور دل و دماغ دونوں تک پہنچتی ہے۔ اس لیے یہ خوف بے سود ہے کہ کمپیوٹر خطاطی کے لیے مہلک ہے، بلکہ اگر کمپیوٹر آپریٹر خطاطی کے فن سے بھی واقف ہو تو حسن کاری کا عمل زیادہ موثر ہو سکتا ہے۔

Professor,
Deptt. of Urdu, Central University of Hyderabad.

□□□

محمد عارف اقبال

اردو کی بقا کے لیے چند عملی تجاویز

اردو کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ اس کے چاہنے والوں نے ہی اس کے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جس کی نظیر لسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ قوموں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ لسانی بنیاد پر نہ جانے کتنی جنگیں لڑی گئیں اور آج بھی دنیا کے بہت سے حصوں میں مختلف قومیں اپنی زبان کی محبت میں اپنے ہی جیسے انسانوں کے خون کی پیاسی بنی ہوئی ہیں۔ یہاں اس مثال کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ زبان کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے نہ کہ لسانی بنیاد پر کسی تخریبی کوشش کی حمایت، بلکہ لسانی بنیاد پر لڑنا سرے سے حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ اس مثال سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں لوگ اپنی زبان کے سلسلے میں کس درجہ حساس ہیں کہ جنگ و جدل سے بھی گریز نہیں کرتے لیکن اس کے برعکس اردو حلقے میں معدودے چند کے سوا ایسے لوگ کم ہی ہیں جن کو اپنی زبان سے اس درجہ محبت ہے کہ وہ خود بھی اردو کے شیدائی ہوں اور ان کی نسل بھی اردو لکھنا، پڑھنا سیکھ کر اردو کی نمائندگی کر سکے۔ مذکورہ مثال کا مقصد یہ بھی ہے کہ اردو سے وابستہ حضرات اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں کہ جس زبان کا دم بھرتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھکتی لیکن خود اپنی مادری زبان کی ترقی کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھاتے اور نہ ہی خلوص نیت کے ساتھ اردو کی بقا کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کو تیار ہیں۔ اگر اردو کے نام پر کچھ کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے تو ایسے لایعنی اقدام اٹھائے جاتے ہیں جن سے اردو کو فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔

کوئی بھی زبان اس وقت مستند اور خود کفیل سمجھی جاتی ہے جب وہ عصری تقاضوں کو پورا کر رہی ہو۔ اردو کا ایک دور ایسا بھی رہا ہے جب اس کے شیدائی متحدہ بھارت کے تمام ذی شعور افراد تھے۔ ہر ہندوستانی اردو میں گفتگو کرنا اور لکھنا پڑھنا باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ شاید یہی دور اردو تہذیب کا نقطۂ عروج تھا۔ عصر حاضر میں جس طرح ہر فن اور موضوع پر کتابیں انگریزی زبان میں دستیاب ہیں اسی طرح اس وقت بھی اپنے عہد کے ہر فن و موضوع کی کتابیں اردو میں شائع ہوا کرتی تھیں لیکن جب اردو انحطاط پذیر ہونے لگی اور اس کے شیدائیوں کی تعداد کم ہونے لگی تو اس زبان میں کام کا تنوع رک گیا۔ بالخصوص تقسیم ہند کے بعد اردو کے انحطاط کا گراف تیزی سے نیچے کی طرف آنے لگا کیوں کہ اب اسے وہ سہولیات بھی فراہم نہ تھیں جو کسی مرکزی زبان کو حاصل ہوتی ہیں بلکہ اب یہ زبان نفرت اور حریفانہ چشمک کی علامت بن گئی۔ اس آزمائشی صورت حال میں اسے اپنے چاہنے والوں سے جتنی قربانیاں درکار تھیں وہ بھی نہ مل سکیں۔ لسانی تعصب کی ایسی آگ بھڑکائی گئی کہ وہ لوگ جن کی ہر سانس میں اردو تھی، انھوں نے بھی اردو سے آنکھیں پھیر لیں۔ یہ تاثر بھی قائم کرنے کی کوشش کی گئی کہ اردو اب صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس نازک صورت حال میں اردو سے حقیقی انسیت رکھنے والے اہل علم اور دانشوروں نے اس کے منتشر سرمائے کو اکٹھا کرنے کی کوشش تو کی لیکن اس کی از سر نو بحالی کی کوئی منصوبہ بند اجتماعی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس انفرادی سطح پر بعض کوششوں کو اجتماعی رنگ دینے کی ضرور سعی کی گئی لیکن یہ "اجتماعی کوشش" بھی ناکام ہو گئی کیوں کہ حریفانہ چشمک کے نتیجے میں اس اجتماعیت میں بھی بعض ایسے بھیڑیے داخل ہو گئے جن کی اصل وفاداری اردو دشمنوں کے ساتھ رہی۔ اس نام نہاد اجتماعیت کی سطح سے یہ خوش کن تاثر بھی دینے کی کوشش کی گئی کہ اردو انتہائی شیریں زبان ہے لہٰذا اس کے ادبی ذوق کو بحال رکھا جائے اور اسی ادبی ذوق کے نتیجے میں رفتہ رفتہ یہ زبان ہماری زندگی کا جزو بن جائے گی۔ اس سلسلے میں ترقی پسند ادبا اور شعرا نے کلیدی رول ادا کیا لیکن اس کا انجام کیا ہوا۔ خوش گمانی سے کام لیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ پورے ملک کے ڈگری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہو گئے۔ (اس کا اطلاق بھی ملک کی تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں پر نہیں ہوتا) لیکن ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اردو شعبے کو ترقی دینے میں ہمارے اساتذۂ کرام نے جس سنجیدگی اور بالغ نظری کا ثبوت دیا وہ اظہر من الشمس ہے۔

اب بھی وقت ہے کہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہوں لیکن اس سے قبل اردو کے حقیقی اور فرضی دانشوروں کے مابین خط امتیاز کھینچنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اردو کا کوئی عاشق معروف دانشور بھی نہ ہو لیکن اس کے پاس اردو کے فروغ کا لائحہ عمل ہو جس کی روشنی میں اس کی حقیقی ترقی کی راہ ہموار کی جا سکتی ہو۔ اردو کے ایسے خادم بھی آپ کو مل سکتے ہیں جو آپ کے ایک اشارے کے منتظر ہوں اور اردو کی حقیقی ترقی کے خاکوں میں رنگ بھرنے کے لیے آپ کے شانہ بہ شانہ چلنے کو تیار بیٹھے ہوں۔ اگر آج بھی ملک کی دانش گاہوں کے اردو اساتذہ اپنے مفاد سے بالاتر ہو کر اپنی تنخواہوں کو واقعتاً حلال رکھنے پر کمر بستہ ہو

جائیں تو ان کی کلاس کا کوئی بھی طالب علم اردو سے نابلد نہیں رہ سکتا بلکہ چراغ سے چراغ جلانے کے مصداق یہ طلبہ اپنے اساتذہ کی حقیقی تربیت کے نتیجہ میں معاشرے میں اردو کے لیے تعمیری اور فعال کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ملک کی تمام یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں کے وہ اساتذہ جن کا اردو ادب سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اردو ان کی مادری زبان ہے۔ وہ اس سے والہانہ محبت بھی کرتے ہیں، اپنے اپنے مضمون (سائنس، ٹیکنالوجی، سیاسیات، اقتصادیات، جغرافیہ وغیرہ) میں مفاد یا صلے کے بغیر ایسی کتابیں تیار کر سکتے ہیں جو طلبہ اور عام اردو داں کی عصری معلومات میں اضافے کا باعث ہوں اور اردو کا دامن ان کتابوں کی اشاعت سے وسیع ہو۔

ملک کی موجودہ صورت حال میں جب کہ ہمہ وقت نئے نئے مسائل سے قوم کا وقت اور توانائی ضائع ہوتی رہتی ہے، چند ٹھوس منصوبے بنائے جا سکتے ہیں جن سے اردو کی جڑوں کی آبیاری ممکن ہے۔ ملک میں مزید اردو میڈیم اسکولوں کا کھولا جانا فی الحال ناممکنات میں سے نظر آتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں موجودہ تعلیمی اداروں پر اکتفا کرتے ہوئے ٹھوس منصوبہ بندی ناگزیر ہے۔ مثلاً یہ کوشش کہ ملک میں ہندی اور انگریزی میڈیم کا کوئی بھی اسکول اردو اساتذہ سے خالی نہ ہوتا کہ ہندی اور انگریزی میڈیم اسکول کے طلبہ بھی اردو کو بطور مضمون لے سکیں یعنی وہاں اردو کی تدریس کے لیے اس اسکول میں ایک یا دو اساتذہ لازمی طور پر موجود ہوں جو اپنے ذمے داری کو احسن طور پر انجام دیں اور اردو کی بنیادی ترقی کے لیے مثالی کردار ادا کر سکیں۔ واضح ہو کہ اس اصول پر بعض ریاستی اسکولوں (کنڑ، تیلگو) میں سختی سے عمل کیا جاتا ہے یعنی اگر شمالی ہندوستان کے اردو یا ہندی میڈیم کا طالب علم کسی آندھرا پردیش اسکول میں داخلہ لیتا ہے تو ایک مضمون تیلگو اسے لازماً پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے بغیر وہ امتحان میں کامیابی حاصل کر سکتا۔

اساتذہ اور عوام کے باہمی تعاون سے اردو کی حقیقی ترقی کے لیے ایسی تحریک بھی شروع کی جا سکتی ہے جس کے تحت اردو حلقے کے طلبہ کے لیے ایسا نظم کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہندی یا انگریزی میڈیم میں پڑھتے ہوئے ایک مضمون اردو ضرور پڑھیں۔ اس طرح ہر سطح پر کالجوں اور اسکولوں کے کتب خانوں میں اردو کتب رکھنے کا خصوصی نظم کیا جائے اور طلبہ کو کتابیں پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔ کالجوں اور اسکولوں میں ہر ماہ اردو کوئز کے پروگرام منعقد کرائے جائیں۔ یہ کام اساتذہ اپنی ذمے داری پر انجام دیں۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ کو اس بات کی بھی ترغیب دی جائے کہ وہ ہر ماہ کوئی اخبار نکالیں اور اسکول یا کالج کے کامن روم میں چسپاں کریں۔ اس طرح کی سرگرمیوں سے طلبہ کے اندر تخلیقی صلاحیت پیدا ہوگی۔ اس سے جہاں ان کا ذہن تجسس اور فنی مہارت کی طرف راغب ہوگا وہیں ان کے اندر مطالعے کا ذوق بھی بیدار ہوگا۔ محبانِ اردو کو چاہیے کہ وہ اس کا بھی نظم کرائیں کہ اگر کسی اسکول یا کالج کا کوئی طالب علم سائنس یا دیگر مضامین کا امتحان اردو رسم الخط میں دینا چاہے تو اسے کوئی دشواری نہ ہو۔ اس طرح کے طلبہ کی کاپیوں کی جانچ کے لیے اردو جاننے والے اساتذہ سے تعاون لیا جائے تا کہ درست نمبر دیے جا سکیں۔

اگر ملک کی تعلیم و دانش گاہوں میں اساتذہ، طلبہ، والدین، مخلص دانشوروں اور محبان اردو کے باہمی اعتماد و تعاون سے ٹھوس اور سنجیدہ لائحہ عمل تیار کیا جائے اور اس پر سنجیدگی سے عمل کیا جائے تو اردو کی جڑیں اپنی زمین میں نئی توانائی کے ساتھ پھیلیں گی اور وہ دن دور نہیں ہوگا جب اردو کے درخت کی شاخوں پر ایک بار پھر پھل لگنے شروع ہو جائیں گے۔

Urdu Book Review
1739/3, (Basement), New Kohinoor Hotel,
Pataudi House, Darya Ganj, Delhi-110006

□□□

کلیاتِ میر (جلد اوّل)

مرتب: ظل عباس عباسی/ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ

''کلیاتِ میر'' کے اس نسخے کی بنیاد ظل عباس عباسی مرحوم کے مرتب کردہ نسخے پر ہے جو پہلی بار 1968 میں شائع ہوا تھا اور چھ مکمل دیوانِ غزلیات پر مشتمل تھا۔ اس ایڈیشن میں کتابت اور قرأت کی وہ غلطیاں دور کر دی گئی ہیں جو متن میں راہ پا گئی تھیں اور وہ اشعار بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو دوسرے معتبر ماخذ سے حاصل ہوئے ہیں۔ ابتدا میں میر کی زندگی اور شاعری پر مستند اہل قلم کی تحریریں، ان کے اہم اقتباسات بھی شامل ہیں۔
میر کے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک گراں بہا تحفہ ہے۔
صفحات: 870، قیمت: -/336 روپے

کلیاتِ پریم چند

مرتب: مدن گوپال

اردو فکشن کے بنیاد گزاروں میں منشی پریم چند کا نام سرِ فہرست ہے جنھوں نے ناول اور مختصر افسانے کی اصناف کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ انھیں وقار اور اعتبار بھی بخشا۔ منشی پریم چند کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز اردو سے ہوا تھا، پھر وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے اور وہاں بھی اپنے عہد کی سب سے بڑی ادبی شخصیت کہلائے۔
کونسل نے پریم چند کی تمام تحریریں اس کلیات میں مجتمع کر دی ہیں جو 24 جلدوں پر مشتمل ہے۔ 22 جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔
22 جلدوں کی قیمت -/3395 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

اسعد فیصل فاروقی

اردو میں سائنسی صحافت

ہندوستان میں سائنسی صحافت کی شروعات 1818 میں ہوئی جب ''دگ درشن'' نام کے ایک رسالے نے ہندی، بنگالی اور انگریزی میں سائنسی تحقیقات سے متعلق کچھ مضامین شائع کرنا شروع کیے۔ اس کے علاوہ اسی صدی میں مختلف زبانوں میں سائنسی موضوعات پر کچھ کتابیں بھی سامنے آئیں لیکن اردو میں سائنسی صحافت کا معیار بہتر نہیں تھا اور نہ ہی کوئی رسالہ یا اخبار اس مناسبت سے اس وقت تک شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس موضوع پر اردو میں پہلا اخبار سرسید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے 1866 میں شائع ہونا شروع ہوا۔ سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کے تحت جدید علوم وفنون کی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کرایا اور جدید سائنسی اصطلاحات کو اردو میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ 1928 میں مولوی عبدالحق کی قیادت میں انجمن ترقی اردو نے ایک سہ ماہی رسالہ ''سائنس'' کے نام سے جاری کیا جو 1945 تک شائع ہوا۔

بیسویں صدی کی آمد دنیا میں سائنسی صحافت کے لیے ایک نئی روشنی لائی اور سائنس کی دنیا میں نئے دور کا آغاز ہوا۔ نئی نئی ایجادات و انکشافات کا دور شروع ہوا۔ سائنسی خطبے، سائنسی نمائش اور مذاکروں کا انعقاد ہونے لگا علاوہ ازیں معلوماتی سائنسی رسالے بھی شائع ہونا شروع ہوئے جو عوامی سطح پر سائنسی معلومات بہم پہنچانے کے ذرائع بنے لیکن ہندوستان میں ان سائنسی سرگرمیوں کی رفتار بڑی سست تھی اور اس بات کی کمی محسوس کی گئی کہ اس وقت ہندوستان میں عوامی سطح پر فروغ سائنس کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا۔

آزادی کے بعد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے فروغ سائنس اور اس کی تحقیقی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کے ترقیاتی کاموں میں دلچسپی لی۔ انھوں نے آزاد ہندوستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور ہندوستان میں سائنس وٹیکنالوجی کو ایک نئی روح عطا کی۔ یہ انھی کی پیش قدمی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان نے سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں اتنی ترقی کی ہے۔ نشریے اور ڈیجیٹل میڈیا نے فروغ سائنس کے لیے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعے ہم سائنس سے متعلق کسی بھی اطلاع کو دنیا کے کسی بھی کونے سے چند لمحوں میں حاصل کر سکتے ہیں۔

سائنسی صحافت کے لیے مثبت بات یہ ہے کہ آج انگریزی، ہندی، اردو اور علاقائی زبانوں کے اخباروں میں سائنسی رپورٹوں اور خبروں کو جگہ ملنے لگی ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں بھی اردو دیگر زبانوں سے پیچھے ہے علاوہ ازیں وہ رسائل جو صرف سائنس کے لیے مخصوص ہیں، ان کی بھی اردو زبان میں کمی ہے۔ انگریزی اور ہندی میں کچھ خالص سائنسی اخبارات ورسائل مستقل شائع ہو رہے ہیں لیکن اردو میں صرف دو رسائل اس وقت سائنسی صحافت کا احاطہ کر رہے ہیں۔ اس میں سے ایک کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی طرف سے شائع ہونے والا سہ ماہی ''سائنس کی دنیا'' ہے جو گذشتہ تقریباً 30 سال سے اردو میں سائنس کو فروغ دینے کی کوششوں میں ہے۔ دوسرا انجمن فروغ سائنس کی طرف سے شائع ہونے والا ماہنامہ ''سائنس'' ہے جو پچھلے 10 برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ حال ہی میں دیہی علاقوں میں فروغ سائنس کے لیے کام کرنے والی ایک غیر سرکاری تنظیم سائنس اینڈ کائنات سوسائٹی آف انڈیا نے بھی اس جانب توجہ کی ہے اور خالص سائنسی ماہانہ اخبار'' سائنس اور کائنات'' علی گڑھ سے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ وہ رسائل جو سائنس، ماحولیات اور صحت سے متعلق مضامین کو مستقل جگہ دیتے ہیں ان میں اردو دنیا (نئی دہلی)، یوجنا (نئی دہلی)، تہذیب الاخلاق (علی گڑھ)، فیض ہند (دہلی)، الشفا (نئی دہلی) اور آیات (علی گڑھ) شامل ہیں۔

1989 میں انرجی اینڈ انوائرمنٹ گروپ اور این سی ایس ٹی سی کے ذریعے کیے گئے ایک سروے کے مطابق جولائی سے لے کر دسمبر 1989 کے درمیان چھ مہینے کے وقفے میں مختلف اخباروں میں سائنسی کوریج تقریباً 2.1 سے 6.56 فیصد کل پڑھے جانے والے حصے میں سے ہے جس میں اشتہارات کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سائنسی معلومات یا سائنسی رپورٹ جن کی مختلف اخباروں میں شمولیت کی جاتی ہے ان میں سے کتنی بیرونی ممالک اور کتنی اندرون ملک سے حاصل کی جاتی ہیں اس سروے کے مطابق زیادہ تر سائنسی معلومات بیرونی ممالک کے موقر اخباروں ومعتبر سائنسی جریدوں مثلاً نیو یارک ٹائمس، گارجین، نیچر اور سائنس سے حاصل کی جاتی ہیں۔

ہندوستان میں سائنسی صحافت کو مضبوط بنانے اور سائنسی رپورٹوں اور معلومات کو اخبارات ورسائل تک پہنچانے کے لیے این سی ایس ٹی سی (NCSTC) نے ایک ریسورس لیٹر (Resource Letter) ''SROTE'' 1988 سے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ بعد میں سائنسی صحافت کی پریشانیوں کو دفع کرنے کے لیے اسے ہفتہ وار کر دیا گیا۔ اس وقت این سی ایس ٹی سی کے ذریعے دی گئی اس سہولت کو تقریباً ڈیڑھ سو اخبارات ریسورس لیٹر کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی سے وابستہ لوگ جدید سائنسی ترقیات کو عام فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کریں تاکہ سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کو عام لوگوں تک پہنچایا جا سکے اور سائنسی صحافت کو ترقی دی جا سکے۔

Allah Wali Kothi, Dodhpur, Civil Line, Aligarh, (U.P.)

عبیدالرحمٰن

البرٹ آئنسٹائن ـــ دو صدیوں کا نقاش

شہرہ آفاق سائنس داں البرٹ آئنسٹائن (1955-1879) ایک بار پھر خبروں میں ہیں۔ اقوام متحدہ اور پوری دنیا کا سائنسی سماج آئنسٹائن کے کراماتی سال 1905 کے سو سال پورے ہونے کے پیش نظر سال 2005 کو علم طبیعیات کے بین الاقوامی سال کے طور پر منا رہا ہے۔ اس سال آئنسٹائن اپنے تین انتہائی اہم اصولوں کے ساتھ سامنے آئے۔ یہ اصول تھے نوری برقی اثر (Plotoelectric effect)، مخصوص اصولِ اضافیت (Special theory of relativity) اور بروانی حرکت (Brownian movement)۔ ان اصولوں نے اس زمانے میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور یہ انقلاب صرف اسی زمانے تک محدود نہیں رہا بلکہ آنے والے عہد تک پھیل گیا۔ لہٰذا ان اہم ایجادات کے لیے ہی 2000 میں ''ٹائم'' جیسے بین الاقوامی شہرت کے رسالے نے آئنسٹائن کو ''مین آف دی ملینیم'' کا خطاب عطا کیا۔ اسی سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اقوام متحدہ نے خالص سائنس (Pure Science) کے ایک اہم شعبے علم طبیعیات (Physics) میں اس عظیم سائنس داں کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سال 2005 کو علم طبیعیات کا بین الاقوامی سال قرار دیا ہے۔ اس طرح البرٹ آئنسٹائن دو صدیوں کے نقاش کے طور پر تسلیم کیے جا چکے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا خاص دریافتیں تھیں جن کی وجہ سے آئنسٹائن کی شخصیت دو صدیوں پر محیط ہے۔ دراصل طبیعیات کو اگر کسی نے پہلی دفعہ فلسفیانہ روشنی میں سمجھنے اور اس کا معائنہ کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ آئنسٹائن ہی تھے۔ انھیں یہ محسوس ہوا کہ کائنات میں ہمارے لیے حیرت ناک راز اور عجیب و غریب معمے پوشیدہ ہیں۔ ان کے تجسس نے انھیں کائنات کو سمجھنے کی طرف راغب کیا اور پھر اپنے مشاہدے کی بنا پر انھوں نے جو تصوراتی ہنگامہ کھڑا کیا وہ یہ تھا کہ زماں (Time) اور مکاں (Space)، مادّہ (Matter) اور توانائی (Energy) باہم منسلک ہیں۔ اس وقت یہ محض آئنسٹائن کا تصور تھا جس کے لیے کوئی تجرباتی ثبوت پیش نہیں کیے گئے تھے مگر اب تمام شواہد اور تجربات کی روشنی میں یہ تصوراتی پیشکش ٹھوس حقیقت ثابت ہو چکی ہے اور آج بھی نظریہ ٹیکنالوجی، پالیسی اور فلسفے کے خدوخال متعین کر رہا ہے۔

البرٹ آئنسٹائن 14/ مارچ 1879 کو جنوبی جرمنی کے شہر الم میں پیدا ہوئے مگر بچپن کا بیشتر حصہ میونخ میں گزرا۔ انھیں عہدِ طفلی سے ہی ریاضی اور موسیقی (وائلن) سے گہرا شغف تھا۔ وہ 16 سال کی عمر میں اسکول سے فارغ ہوئے تو مزید حصولِ علم کے لیے کالج میں داخلہ آسان ثابت نہیں ہوا۔ انھیں بڑی مشکلوں سے زیورچ کی پالی ٹیکنک اکادمی میں داخلہ ملا۔ یہاں انھوں نے ریاضی اور طبیعیات کے علاوہ شوپن ہاور اور کانٹ کے فلسفے، ڈارون کے نظریۂ ارتقا اور اشتراکیت کی اقتصادیات کا بھی بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا اور ساتھ ہی جوشیم کی وائلن سے بھی محظوظ ہوئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ نوکری کی تلاش میں بھٹکتے رہے اور آخر کار 1905 میں سوئٹزرلینڈ کے ایک پیٹنٹ دفتر میں کلرک بحال ہوئے۔ اسی جگہ کام کرتے ہوئے انھوں نے اپنے مشاہدے کو مضمون کی شکل دی اور ایک اخبار میں بڑی گزارشوں کے بعد شائع کرایا جس میں کائنات کے راز اور جوہر (Atom) کے راز بیان کیے تھے۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد مضمون تھا لہٰذا سائنس داں، فلسفی یہاں تک کہ جنگ باز بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور سب نے اپنے اپنے طور پر نتائج اخذ کیے۔ حالاں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب آئنسٹائن محض ایک گمنام کلرک تھے۔ آئنسٹائن نے اپنے نظریے سے طبیعیات پر نیوٹن جیسے معروف سائنس داں کے دو سو سالہ تسلط کو ختم کیا تھا اور ٹھیک اسی طرح ایک نئی سائنس کی بنیاد رکھی جس طرح خود نیوٹن نے ارسطو کا غلبہ ختم کر کے ایک نئی سائنس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ جیسے جیسے آئنسٹائن سے لوگ واقف ہوتے گئے وہ ان کے سامنے کھلتے گئے، ان کا سکہ جمتا گیا اور پھر یہ ہوا کہ ان کے پاس مختلف یونیورسٹیوں سے نوکری کی پیش کش آنے لگی۔ زیورچ یونیورسٹی نے انھیں پروفیسر کے عہدے کی پیش کش کی تو یوٹریچٹ اور لیڈن نے بھی انھیں ایسے عہدے پیش کیے۔ آخر کار اس دوڑ میں برلن یونیورسٹی سب پر سبقت لے گئی اور وہاں آئنسٹائن نے پروفیسری قبول کر لی۔

آئنسٹائن کے اصول ایک عرصے تک سائنس دانوں کے لیے معمہ بنے رہے۔ وہ مستقل ان کو سمجھنے کی کوششوں میں مصروف رہے اور ان کی طبعی تشریح طلب کرتے رہے۔ پھر ہر طرح سے جانچنے پرکھنے کے بعد یہ اصول اتنے اہم

گیر اور وسیع ثابت ہوئے کہ ان میں قدرت کے تمام مظاہر سما گئے۔ اپنے اصول براونی حرکت میں آئنسٹائن نے اس کے واضح ثبوت پیش کیے کہ تمام مادّے نہایت مختصر ذرّات (Particles) سے بنے ہیں جنھیں جوہر کہا جاتا ہے۔ یہ مستقل حرکت میں رہتے ہیں اور جس قدر تیزی سے حرکت کرتے ہیں اتنی ہی زیادہ توانائی خارج کرتے ہیں۔ یعنی ذرّات میں بے حد توانائی موجود ہوتی ہے۔ اسی خیال کی پیش کش آئنسٹائن سے قبل غالب نے بھی کی تھی۔ اگرچہ یہ ایک الگ بحث ہے کہ غالب کی فکر طبیعیاتی فکر کی کیوں کر حامل ہوئی بہرحال دو عظیم شخصیتیں ایک طرح سے سوچتی ہیں۔ غالب فرماتے ہیں:

اب آرزوئے شوقِ قیامت نہیں مجھ کو
دنیا کے ہر اک ذرّے میں سو حشر بپا ہیں

بہرحال، یہ وہ بنیادی اصول تھا جس پر جوہری بم کی تحقیق ممکن ہو سکی۔ دراصل ایک جوہر کی تمام تر توانائی یا قوت اس کے مرکزے میں موجود ہوتی ہے۔ ان مرکزوں کو جوڑ کر بذریعہ انضمام (Fusion) توانائی حاصل کی جاتی ہے۔ جوہری بم میں مرکزوں کو توڑنے کا عمل کیا جاتا ہے جب کہ ہائیڈروجن بم میں مرکزوں کو جوڑنے کا عمل کرتے ہیں۔ یہ جوہری بم سے ہزاروں گنا زیادہ توانائی خارج کرتا ہے۔

آئنسٹائن کا مخصوص نظریۂ اضافیت 1905 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کے مطابق کوئی مادّی جسم روشنی کی رفتار سے نہیں چل سکتا۔ روشنی کی رفتار (تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ) اگر حاصل ہو جائے تو جسم کی کمیت (Mass) لامتناہی ہو جائے گی اور اس سے منسوب وقت کی رفتار بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ وہ اصول تھا جس نے اس زمانے کے سائنس دانوں کے دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس اصول کو شروع میں بہت ہی کم لوگ سمجھتے تھے۔

اس اصول میں پورے عالم کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے جس میں زماں ومکاں واحد شے کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اسے انگریزی میں Space اور Time کی جگہ صرف ایک لفظ Spacetime سے ظاہر کرتے ہیں۔ آئنسٹائن کے مطابق دنیا میں صرف ایک شے ہے جس کے لیے زماں ومکاں صفر کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ ہے روشنی۔

روشنی کی ایک کرن ایک بار اپنا سفر شروع کردے تو پھر وہ نہیں رکتی یہاں تک کہ کوئی ٹھوس چیز اس کی راہ میں حائل ہو کر اسے منتشر نہ کردے۔ اس کا مشاہدہ یوں کر سکتے ہیں کہ اگر روشنی کی کرن کو شیشے کے تکون یعنی منشور (Prism) سے گزاریں تو وہ کرن قوسِ قزح کے رنگوں میں منتشر ہو جاتی ہے اور پھر جب یہ تمام رنگ مل جاتے ہیں تو روشنی کا پیلا پن سفید شکل لے لیتا ہے۔ یعنی روشنی کا مزاج دوہرا ہے کہ یہ لہر کی صورت بھی نمایاں ہوتی ہے اور توانائی کے انفرادی پیکٹ کے طور پر بھی۔ روشنی کے حوالے سے برقی نوری اثر (Photoelectronic effect) وہ مقالہ تھا جس نے بعد میں شعاع کے قدری میکانیات (Quantum Mechanics) کی داغ بیل ڈالی۔ یہاں ہم یہ بھی جان لیں کہ توانائی کا بنیادی یونٹ کوانٹم کہلاتا ہے اور یہ کوانٹم دراصل توانائی کا اخراج ہے جسے فوٹون ذرّہ بھی کہا جاتا ہے۔ آئنسٹائن نے اپنے اصولِ اضافیت کے اظہار کے لیے ذیل کا مساوات پیش کیا:

E=MC2

یعنی ت = کXر

'ت' سے مراد توانائی اور 'ک' سے مراد کمیت ہے۔ ر سے مراد روشنی کی رفتار ہے۔ کمیت (Mass) کسی چیز کے جسم، ضخامت اور وزن کو ملا کر کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نظریہ اضافیت کا بیان یوں ہو سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی بھی شے بالکل ویسی نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں۔ ہماری سوچ پر ہمارے گرد و پیش کے ماحول کا اثر ہوتا ہے یعنی زماں و مکاں، زندگی، عمر، یہ سب لازمی طور پر وہ نہیں ہیں جیسا ہم سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ وقت مختلف جگہوں پر تبدیل ہوتا رہتا ہے کہ جب ہمارے ملک میں دن کے بارہ بجے ہوں تو نیو یارک میں رات کے بارہ یعنی یہ وقت مشاہدہ کرنے والوں کے لیے الگ الگ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم ہر چیز کے تین پہلو دیکھتے ہیں یعنی لمبائی، چوڑائی اور موٹائی یا اونچائی۔ مگر آئنسٹائن کے مطابق ہر چیز کے چار پہلو ہوتے ہیں اور یہ چوتھا پہلو ہوتا ہے وقت جسے ہم اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھ سکتے مگر یہ ہر شے سے وابستہ ہے۔

جیسا کہ مضمون کے شروع میں ذکر آیا کہ آئنسٹائن نے طبیعیات پر نیوٹن کے تسلط کو ختم کر کے اس کے خیالات کی از سرِ نو تشریح کر دی تھی۔ مثلاً نیوٹن نے کہا تھا کہ ہر شے ساکن رہنے کی کوشش کرتی ہے مگر یہ حرکت ایک دوسرے کی نسبت سے ہوتی ہے لہٰذا اگر دو چیزیں ایک ہی سمت میں ایک ہی جیسی حرکت کر رہی ہوں تو وہ یقیناً ایک دوسرے کے لیے ساکن ہوں گی مگر باقی سب کے لیے متحرک۔ حرکت کی رفتار اور سمت مشاہدہ کرنے والے کے مقام کی نسبت سے طے پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر زمین کی سطح دیکھنے والوں کو زمین پر متحرک جو شے سیدھی نظر آئے گی، خلا سے مشاہدہ کرنے والوں کو اس کی راہ گولائی لیے نظر آئے گی۔ اسی لیے چلتی ٹرین کی رفتار ساکن شخص کے لیے ایک ہوتی ہے، اسی سمت میں جانے والی دوسری ٹرین کے مسافروں کے لیے دوسری ہوتی ہے اور مخالف سمت میں جانے والی ٹرین کے مسافروں کے

لیے تیسری ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی اصول کی طرح کسی چیز کی جسامت بھی مشاہدہ کرنے والوں کی حالت پر منحصر ہوتی ہے۔ حرکت سے کسی شے کی جسامت چھوٹی ہو جاتی ہے اور یہ مختلف وقتوں میں مختلف نوعیت کی ہوتی ہے کہ جوں جوں رفتار تیز ہوتی جائے گی جسامت کم ہوتی چلی جائے گی۔

آئنسٹائن نے اپنے اصول اضافیت کا اطلاق کششِ ثقل (Gravitational Force) پر بھی کیا تھا۔ اس سلسلے میں نیوٹن کا کہنا تھا کہ زمین کی کشش کے باعث ہر چیز سیدھی زمین پر گرتی ہے مگر آئنسٹائن کا نظریہ تھا کہ کشش بھی مطلق اور غیر مشروط نہیں ہے۔ ہر شے کی کشش کا ایک حلقہ ہے اور کشش کی راہ سیدھی ہونے کی بجائے خم دار ہے۔ نیوٹن نے روشنی کی راہ کو سیدھا بتایا تھا مگر اسے آئنسٹائن نے خم دار کہا کہ سورج اور ستاروں سے آنے والی روشنی زمین تک پہنچنے میں مڑ جاتی ہے۔ اسی طرح زمین سے دیکھنے پر سورج کے علاوہ ستارے اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے لگتے تھے۔ نیوٹن کی ریاضی اس کی صحیح تشریح سے قاصر رہی تھی مگر آئنسٹائن کے نظریے کے ساتھ بھی یہ مشکل درپیش تھی کہ عملی طور پر اس کا بھی مشاہدہ نہیں ہو سکا تھا۔ مگر 1919 میں سورج گرہن نے یہ موقع بھی فراہم کر دیا کہ آئنسٹائن کے ذریعے پیش کردہ روشنی کی خمیدگی کے انداز اور زاویے کا تصور سورج گرہن کے مشاہدوں سے حاصل نتائج سے پوری طرح ہم آہنگ ثابت ہو گئے۔ آئنسٹائن کے نظریۂ اضافیت کو جانچنے کا یہ پہلا موقع تھا جس کا مشاہدہ اس وقت کے بڑے سائنس دانوں خصوصاً ایڈنگٹن کی موجودگی میں کیا گیا اور اس اصول کو ہر لحاظ سے بالکل صحیح پایا گیا۔ بعد میں کئی اور ایسے مواقع ملے اور ہر بار آئنسٹائن کا اصول اغلاط سے پاک قرار پایا اور نیوٹن کا نظام اس اصول کا ایک حصہ بن کر رہ گیا۔

ماہرینِ طبیعیات نے مشاہدے اور غور و فکر کی بنیاد پر آئنسٹائن کے علاوہ صرف نیوٹن اور آرشمیدس کو ہی اعتبار بخشا ہے کہ ان شخصیتوں نے دنیا کے سامنے طرزِ فکر کی صحیح روح کو پیش کیا ہے۔ آئنسٹائن کے کراماتی سال کی صد سالہ تقریبات کے سربراہ امریکہ کے فزیکل سوسائٹی سے وابستہ ایلین کوڈوس (Alan Chodos) کا یہ بیان قابل غور ہے کہ میرے نزدیک آئنسٹائن کے مخصوص نظریات وجدانی نہیں ہیں بلکہ ان کا وہ اندازِ فکر ہے جو وہ قدرت کو سمجھنے میں بروئے کار لاتے ہیں۔ اسی طرح سنٹ لوئس، واشنگٹن یونیورسٹی کے ماہر طبیعیات اور Einstein 1905: Standard of Greatness کے مصنف جان رگڈن (John Rigden) کا کہنا ہے کہ

آئنسٹائن جیسے مفکر نصف ہزار سال کی مدت میں ایک بار پیدا ہوئے ہیں۔

سِمٹری (Symmetry) میگزین کے مدیر اور ماہر طبیعیات ڈیوڈ ہیرس (David Harris) کے مطابق آج ہم آئنسٹائن کی دنیا میں جی رہے ہیں۔ یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ آئنسٹائن کو کائناتی فلسفے کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ انسانی سماج کی خوش حالی کی فکر رہی۔ انھوں نے سائنس دانوں کو یہ تنبیہ کی تھی کہ انسان اور سماج کی خوش حالی ہی آپ کا خاص مقصد ہونا چاہیے۔ وہ انگلینڈ، فرانس، اسپین، ہالینڈ غرض جہاں جہاں گئے، انسانیت کو بحال کرنے کی اپیل کرتے رہے۔ وہ جوہری توانائی کے بم کی شکل میں غلط استعمال کے امکان پر بے چین ہو اٹھے تھے اور جنگ و تخریب کو بڑھاوا دینے والے تجربات و اقدامات پر روک لگانے کی مانگ کی تھی۔ اسی لیے انھوں نے 1939 میں صدر فرینکلن ڈی روزولٹ (Franklin D. Roosevelt) کو اپنے ایک خط میں ایسے بم کے خطرات سے آگاہ کیا تھا۔ آج پوری عالم انسانیت اسی پہلو پر غور کر رہی ہے کہ کس طرح امن و آشتی بحال کی جائے اور جنگ و تخریب سے بچا جائے۔ آج ہم آئنسٹائن کی دنیا میں اس طرح جی رہے ہیں کہ ان کے اصولوں کی کار فرمائی کافی بنانے والے سے لے کر کمپیوٹر چپس، یا پھر ایم آر آئی (جس سے امراض کی تشخیص کی جاتی ہے) اور ان دواؤں تک دراز ہے جن سے امراض کا علاج ممکن ہو سکا ہے۔ وہ لیزر جو سی ڈی کو چلاتے ہیں اور وہ سٹلائٹ جو ٹیلی ویژن کو سگنل فراہم کرتے ہیں حتی کہ وہ ریموٹ کنٹرول جس سے ہم ٹی وی کے چینل بدلتے رہتے ہیں ان سب میں اسی سائنس کا دخل ہے جو عظیم سائنس داں البرٹ آئنسٹائن کی مرہونِ منت ہے۔ یہ وہ شخصیت تھی جس نے دنیا ہی بدل ڈالی۔

آئنسٹائن کے نظریے کے مطابق کائنات ارتقا پذیر ہے۔ انھوں نے قدرت کو ہر لمحہ سمجھنے کی کوشش کی تھی اور ان کی یہ کوشش جیسے جیسے گہری ہوتی گئی، نت نئے انکشافات رونما ہوتے گئے اور قدرت کے بنیادی اصول ظاہر ہوتے گئے۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ قدرت میں تنظیم موجود ہے اور یہی تنظیم سائنس کی تعمیر کی بنیاد بنی رہے گی۔ لہٰذا ظاہر ہوا کہ قدرت کی نے میں ہی سائنس کو ضم کر کے ہم سائنس کو تعمیری بنا سکتے ہیں۔ یہی آئنسٹائن کا عقیدہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہیں۔

M-2, Regal Building, Street No. 6, Zakir Nagar,
New Delhi - 110025

□□□

تحریر: جگدیپ سکسینہ
مترجم: رئیس احمد

روبوٹ —— ایک انسانی متبادل

بائیسویں صدی! کارخانہ ٹھپ پڑا ہے۔ مزدور روبوٹ ہڑتال پر ہیں۔ روبوٹ یونین نے انسانی مزدوروں کے برابر تعطیلات اور تنخواہیں بڑھانے کی مانگ کی ہے علاوہ ازیں روبوٹ لیڈر نے انسانوں کو کارخانوں سے باہر بھگانے کی دھمکی بھی دی ہے۔ یہ نہایت واضح اور قدیم مخیلہ روایت آج بڑی تیز رفتاری کے ساتھ حقیقت کی شکل اختیار کررہی ہے۔ دنیا میں لاکھوں روبوٹ کارخانوں اور مشکل مقامات سے لے کر گھروں اور دفتروں میں نہایت ضروری اور اہم ذمے داریاں انجام دے رہے ہیں۔ حال ہی میں اقوامِ متحدہ اور بین الاقوامی روبوٹکس یونین نے دنیا میں روبوٹ کی بڑھتی ہوئی مانگ اور مقبولیت پر ایک مبسوط روداد پیش کی ہے، اس کے مطابق فی الوقت دنیا میں چھ لاکھ سے زیادہ روبوٹ گھریلو کام کاج میں انسانوں کی معاونت کررہے ہیں۔ ان میں بطور خاص مکانوں کی دیکھ بھال اور صفائی کا کام کرنے والے روبوٹوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ باغیچوں اور لان کی گھاس کاٹنے والے روبوٹ بھی مقبول ہو رہے ہیں۔ اس سے قطع نظر بعض روبوٹ حفاظتی گارڈ ڈیوٹی پر بھی تعینات ہیں۔ عہد حاضر میں کھڑکیوں کی دھلائی، صفائی اور سوئمنگ پول کے رکھ رکھاؤ کی دیکھ بھال کرنے والے روبوٹوں کی مانگ بھی شدت سے بڑھ رہی ہے۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق 2007 تک دنیا میں گھریلو روبوٹوں کی تعداد تقریباً 41 لاکھ تک پہنچ سکتی ہے۔ آج کل بیرونی ممالک کے بازاروں میں اس طرح کے روبوٹ بھی دستیاب ہیں جو نہ صرف آپ کے ساتھ رقص کرسکتے ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر آپ کی خدمت بھی کرسکتے ہیں۔ سونی کمپنی کا آئی۔بی۔ نامی روبوٹ کتا بعض ممالک میں لوگوں کا دل پسند رفیق بن گیا ہے۔ دنیا میں اس طرح کے خوش کن اور پسندیدہ روبوٹوں کی تعداد تقریباً سات لاکھ ہے۔ موجودہ زمانے میں گھریلو روبوٹوں کی روز افزوں تعداد کی کئی وجوہات ہیں۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانے کے روبوٹ پہلے کے روبوٹوں کے مقابلے اپنے کام میں زیادہ کامیاب اور سستے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گھریلو نوکروں کی جگہ روبوٹوں کو کام پر رکھنا اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی مزید مفید ثابت ہو رہا ہے، مزید برآں روبوٹوں کے ساتھ کھانے، پینے، تنخواہ دینے کا کوئی جھنجھٹ نہیں ہے اور نہ ہی ان کے ذریعے چوری کا خوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روبوٹوں کو کل کارخانوں میں بھی بڑے پیمانے پر رکھا جانے لگا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کی صنعتوں میں اس وقت لگ بھگ آٹھ لاکھ روبوٹ کام کررہے ہیں۔ ان میں سے تقریباً آدھے اکیلے جاپان میں ہیں۔ جاپان آج بھی روبوٹکس کی دنیا کا شہنشاہ ہے اور روبوٹ بنانے کے بین الاقوامی کاروبار میں اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ لیکن موجودہ برسوں میں یورپ اور شمالی امریکہ میں بھی صنعتی روبوٹوں کی تعیناتی نے زور پکڑا ہے، یورپ میں بطور خاص جرمنی، اٹلی اور فرانس میں روبوٹوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کی قیمت میں لگاتار کمی آنے کے باعث برازیل، چین اور میکسکو جیسے ترقی پذیر ممالک میں بھی ان کا عام استعمال بڑھنے لگا ہے۔

روبوٹوں کے بین الاقوامی بازار پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ 1995 کے مقابلے 2003 میں روبوٹوں کی قیمت گھٹ کر لگ بھگ ایک چوتھائی رہ گئی، اور یہ گراوٹ ہنوز جاری ہے، رپورٹ میں قیاس لگایا گیا ہے کہ 2007 میں دنیا کے کارخانوں اور کمپنیوں میں کم از کم دس لاکھ روبوٹ کام کررہے ہوں گے۔ یہاں روبوٹ سے مراد ایسی خود کار مشینوں سے ہے جو انسانوں کی طرح کام کرتی ہے اور ان جملہ کاموں کو بخوبی انجام دیتی ہے جو پہلے صرف انسان ہی کیا کرتے تھے۔ انھیں ایک بار پروگرام کرنے کے بعد کسی انسانی مدد یا کنٹرول کی ضرورت نہیں، اسی لیے آج کل یورپی ممالک میں کل کارخانوں میں مزدوروں کی جگہ روبوٹوں کی تقرری کی جانے لگی ہے اور ان کا سب سے زیادہ استعمال موٹر گاڑی بنانے والی کمپنیوں میں کیا جارہا ہے جہاں پر یہ روبوٹ بڑی چابکدستی اور مہارت کے ساتھ موٹر گاڑیوں میں پُرزے جوڑتے جاتے ہیں۔ حال ہی میں روبوٹوں کی ایک نئی قسم بھی منظرِ عام پر آئی ہے جنھیں 'خادم روبوٹ' کہا جاتا ہے۔ نئی قسم کے یہ روبوٹ گائے بھینسوں کا دودھ دوہنے، شفاخانوں میں ضروری سامان اِدھر اُدھر پہنچانے اور سرجن کی معاونت کرنے کے علاوہ زہریلے اور بیکار سامان کو بحفاظت ٹھکانے

لگانا وغیرہ ان کے اہم کاموں میں شامل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت پوری دنیا میں 'خادم روبوٹوں' کی تعداد تقریباً 21 ہزار ہے، اور 2007 تک یہ تعداد بڑھ کر تقریباً 75 ہزار ہو جائے گی۔

رپورٹ کے مطابق موجودہ دہائی کے آخر تک 'خادم روبوٹ' اور بھی کئی اہم کام انجام دینے لگیں گے۔ مثلاً بزرگ اور معذور افراد کے تعاون کے علاوہ آگ بجھانے اور بموں کو ناکارہ بنانے جیسے خطرناک کام کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف آفات کے دوران بچاؤ اور راحت کے کاموں میں بھی انسانوں کے شانہ بشانہ رہیں گے۔ علاوہ ازیں تجربہ گاہوں میں سائنسدانوں کی مدد کرنے کے لیے بھی 'خادم روبوٹ' تیار کیے گئے ہیں۔ آج ایسے روبوٹ بھی بنائے جا رہے ہیں جو گہرے پانی میں اُتر کر ضروری کام کاج بخوبی انجام دیتے ہیں۔ لیکن سب سے دلچسپ اور مناسب روبوٹ عین انسانوں جیسے نظر آنے والے ہیں جو ہوٹلوں میں استقبالیہ (Receptionist) کے فرائض انجام دینے کے علاوہ قدیم عمارتوں کو گرانے اور نئی عمارتوں کی تعمیر میں بھی معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

بڑے ڈیری فارموں میں ہر روز صبح سیکڑوں گائے بھینسوں کا دودھ دوہنا ایک مشکل اور وقت طلب کام ہے۔ اس کام کے لیے دودھ دوہنے والی مشینیں بھی ایک عرصے سے استعمال میں ہیں لیکن ان کے نتائج اطمینان بخش نہیں رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تھنوں میں مشین لگانے سے گائے بھینسوں کو درد محسوس ہوتا ہے، جس کے سبب تھنوں میں دودھ کم آتا ہے۔ اس مشکل کا حل انگلینڈ کی آئس روبوٹکس کمپنی نے تلاش کیا ہے۔ اس نے ایک ایسا روبوٹ تیار کیا ہے جس کے بازو انسانوں کی مانند لچیلے اور ملائم ہیں۔ ان لچیلے بازوؤں میں دیکھنے کے لیے اسٹیریو وژن تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لچیلے اور ملائم بازو اپنے آپ گائے کا تھن ڈھونڈھ کر اس سے چپک جاتے ہیں اور اس عمل میں بازوؤں میں لگا کیمرہ معاون ہوتا ہے جو جدید ترین سوفٹ ویئر کے استعمال سے گائے کے تھنوں کی شناخت کر لیتا ہے اور دودھ دوہتے وقت اس کی گرفت عین انسانوں جیسی ہوتی ہے۔ اس روبوٹ کی مدد سے ایک دن میں گائے سے تین چار دفعہ دودھ دوہنا ممکن ہے، اور اس عمل سے دودھ کی پیداوار میں بیس فیصد کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس روبوٹ میں لگا کیمرہ ڈیری مالک کے کمپیوٹر پر گائے کے مختلف حصوں کی تصاویر بھی پہنچائے گا جس کی بنیاد پر گائے کی صحت پر بھی نظر رکھی جا سکے گی۔ ڈیری فارموں کے مالکان اس نئے روبوٹ کے استعمال سے بہت خوش ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ دہائی میں دنیا کے تمام ڈیری فارموں میں اسی روبوٹ کا دور دورہ ہوگا۔

کل کارخانوں میں روبوٹوں کی تعداد میں اضافے سے کمپنی کا منافع بڑھتا ہے، چونکہ یہ انسانوں کی بہ نسبت زیادہ مہارت کے ساتھ کام کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ ان سے زیادہ دیر تک بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاپان کی پیداواری صنعتوں میں ہر دس ہزار مزدوروں پر 320 روبوٹ کام کر رہے ہیں، جرمنی میں یہ تعداد 148، اٹلی میں 116، سویڈن میں 99 اور مع امریکہ بعض دیگر ممالک میں 80 سے 50 کے درمیان ہے۔

یورپی ممالک میں روبوٹ کے استعمال کے معاملے میں انگلینڈ اب بھی کافی پیچھے ہے، یہاں ہر دس ہزار مزدوروں پر محض 40 روبوٹ ہی کام کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس اگر موٹر گاڑی کی صنعت تک ہی نظر محدود رکھی جائے تو ان کی کثیر تعداد یقیناً چونکانے والی ہے۔ جاپان اور اٹلی میں ہر دس ہزار مزدوروں کے ساتھ 1400 روبوٹ کندھے سے کندھا ملا کر کام کر رہے ہیں یعنی سو انسانوں کے ساتھ ایک سو چالیس روبوٹ ہیں۔

جرمنی میں دس ہزار مزدوروں کے ساتھ ایک ہزار، فرانس میں 910، اسپین میں 800، امریکہ میں 740، انگلینڈ میں 660 اور سویڈن میں 560 روبوٹ موٹر گاڑی بنانے میں مصروف ہیں۔ روبوٹوں کی اس کثیر تعداد کے پیش نظر اگر ایک دن موٹر گاڑی صنعت پوری طرح روبوٹوں کے حوالے ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

جس طرح انسانوں کی ایک عمر متعین ہوتی ہے اسی طرح روبوٹوں کی بھی ایک معینہ مدت ہوتی ہے، اسی کے باعث ایک مقررہ مدت کے بعد انھیں ہٹا کر ان کی جگہ دوسرے روبوٹ تعینات کر دیے جاتے ہیں۔ ان کی مدت حیات اوسطاً بارہ سے پندرہ سال کے درمیان تسلیم کی گئی ہے۔ انھیں ہٹانے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی جگہ لیے گئے نئے روبوٹ تکنیکی اعتبار سے زیادہ چست درست ہوتے ہیں۔ آج عالمی پیمانے پر روبوٹوں کو زیادہ سے زیادہ محنتی، فعال اور قابل استعمال بنانے کی ہوڑ لگی ہوئی ہے۔ مزید برآں ان میں مصنوعی عقل و دانش کے ذریعے انسانی دماغ جیسی خوبیاں پیدا کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، جن میں سوجھ بوجھ اور سوچ و فکر پر خاص طور سے توجہ دی جا رہی ہے۔ اس پس منظر میں اگر مستقبل قریب میں یہ حکم کے غلام ہمارے ہی آقا بن بیٹھیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔

(بہ شکریہ "سہارا ہے"، نئی دہلی، 5/فروری 2005)

□□□

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فائزشہیرعباسی

ہندوستان میں اسلام کی آمد

مذہبی تعصب یا تنگ نظری ہندوستانی روایت میں ایک اجنبی شے رہی ہے۔ صدیوں سے لوگوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنی پسند کا کوئی بھی عقیدہ اختیار کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب وجود میں آئے، جن میں سے ہر ایک دوسرے کے تئیں روادار تھا۔ گذشتہ ابواب میں ہم ہندو، بدھ اور جین مذاہب کا ذکر کر چکے ہیں۔ زرتشت، یہودیت اور عیسائیت اگرچہ زیادہ معروف نہیں مگر یہ بھی ہندوستان میں قدیم زمانے سے ہیں۔ عیسائیت یہاں پر پہلی صدی عیسوی میں سینٹ تھامس کے آنے سے پہنچ چکی تھی یعنی یورپ میں اس کے تعارف سے کئی صدی قبل۔ مذکورہ بالا تمام مذاہب ہندوستانی زندگی کا حصہ رہ چکے ہیں۔

یہاں تک کہ شک، کشان اور ہون، جو ہندوستان میں حملہ آوروں کی حیثیت سے آئے تھے، بتدریج ہندوستانی معاشرے میں جذب ہو گئے، ہندوستان کے عقیدوں کو قبول کیا اور اس کی تہذیب اختیار کی۔ ترک قبائل، جو چھٹی صدی عیسوی میں چین کی عظیم دیوار سے لے کر فارس تک کے وسیع علاقوں پر حکومت کرتے تھے، بدھ مذہب کے پیروکار تھے۔ جب 640 عیسوی میں وہ افغان وادی میں داخل ہوئے تو انھوں نے قندھار کی عظیم ہندو سلطنت کو نیست و نابود کر دیا، اور جب قندھار میں ان کی حکومت کا زوال ہوا تو وہاں پر کابل کی شاہی سلطنت قابض ہوئی جو ہندو مذہب کے داعی تھے۔ بعد میں اوہند (Ohind) کے برہمن راجاؤں نے شاہی راجاؤں کی جگہ لے لی۔ اس کے فوراً بعد ہی، کسی طرح، عرب سے اسلام ایک غیر معمولی طاقت کے ساتھ آیا اور فرانس کی سرحدوں سے لے کر ہندوستان تک کے علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا، اس نے عظیم سلطنتوں کو اکھاڑ پھینکا اور سلطنتوں کا ایک نیا سلسلہ قائم کیا۔ اس نے اس عہد کی سب سے عظیم منظم فوجی طاقت ترتیب دی۔

ہندوستانی لوگوں اور مغربی ایشیا کی عرب سرزمینوں کے درمیان تعلقات عیسوی سال کے آغاز سے بھی کئی صدیوں قبل سے قائم تھے۔

عربوں کو ہندوستان، اس کے مذہب، فلسفہ، ادویہ، ریاضی اور فلکیات شناسی کا گہرا علم تھا۔ امیر خسرو کے مطابق عرب ماہر فلکیات ابو معاشر بنارس آیا تھا اور دس برسوں تک علمِ افلاک کا مطالعہ کیا تھا۔ ہندوستانی عقائد و رسومات بھی مغربی ایشیا اور یورپ تک پہنچ گئے تھے۔ ہندوستان اور عرب کے درمیان تجارت اور تجارتی لین دین بڑے پیانے پر ہوتی تھی۔ اسلامی طاقت سے ہندوستان کا پہلا سیدھا رابطہ آٹھویں صدی میں ہوا، جب سندھ کے ہندو راجا داہر کے تاجروں کے ذریعے گہرے سمندروں میں رہزنی کے ایک معاملے نے بغداد کے خلیفہ کو مشتعل کر دیا۔ اس کے حکم سے محمد بن قاسم نے سندھ کی طرف کوچ کیا اور 712 میں راسو کی جنگ میں ملتان اور بحرِ عرب کے درمیان کے علاقے پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ مسلمانوں نے یہودیوں اور عیسائیوں جو مسلمانوں سے کتاب (صحیفہ) کے ذریعے وابستہ تھے، اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی اجازت دے دی۔ اس کے عوض میں انھیں ایک مخصوص جزیہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ دوسرے عقائد کے لوگوں کو تبدیلیِ مذہب پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں بھی انھوں نے ہندوؤں کو یہ رعایت بخشی۔

محمد بن قاسم کی فوجوں نے، جن کی بنیاد ہندوستانی سرزمین پر مستحکم ہو چکی تھی، برِ اعظم کی جانب سے راجستھان میں داخل ہونے کی سنجیدہ کوشش کی مگر یہ عرب جو ہندوستان آئے تھے ان میں وہ عظیم قوت نہیں تھی جو ان کی مغربی اور مشرقی سرگرمیوں میں نمایاں تھی۔ انھوں نے گجرات، کچھ، بڑوچ اور سوراشٹر پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ کسی طرح، گجرات اور راجستھان کے حکمرانوں نے عربوں سے لگاتار مقابلہ کیا اور ان کی پیش قدمی کو روکا۔ اس کے نتیجے میں، سندھ پر عرب کی فتح ہندوستانی تاریخ میں محض ایک غیر اہم حصہ بن کر رہ گئی۔

محمد بن قاسم کی فوجوں کے دور ہونے کی بنا پر، خلیفہ کی گرفت بہت معمولی تھی۔ اس لیے، جب خلیفہ کا اقتدار ختم ہو رہا تھا، اس نے صوبۂ سندھ کو ایک مشہور عرب رہنما کے حوالے کر دیا اور عرب نمائندے کی موت کے فوراً بعد سندھ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا: ملتان اور منصورہ (برہمن آباد کے نزدیک)۔ یہ نئے مسلم حکمرانوں کے دو پایۂ تخت بن گئے۔ دونوں اپنے ہندو ہمسایوں سے خوف زدہ تھے۔

● "Turning Points of Indian History" جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب ہے جس میں ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنھوں نے ہندوستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ "اردو دنیا" میں اس کا ترجمہ "ہندوستانی تاریخ کے اہم موڑ" کے نام سے قسط وار شائع کیا جا رہا ہے۔

خلیفہ کی طاقت کا خاتمہ ہونے کے ساتھ ہی وسط ایشیا کے ترکی قبائل (تورانی) اور چینی ترکستان کی جانب سے خودمختاری کا اعلان ہوگیا، جن کا تقرر عرب حکمرانوں کے ذریعے محافظ کی خدمات انجام دینے کے لیے کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر نے آزاد ریاستیں قائم کرلیں۔

دراصل، ترکوں نے، جو عربوں کے سب سے زیادہ قابل اعتماد غلام تھے، عرب طاقت کو ایک زبردست جھٹکا دیا اور مسلم طاقت کے مرکز کو بغداد سے سمرقند اور ہرات میں منتقل کردیا۔ بغداد کے تئیں وفاداری کی اہمیت ختم ہوگئی تھی۔ انھوں نے اپنی ذاتی سلطنتیں قائم کیں۔ ان میں سے ایک غزنی میں تھی۔ اسے خراسان کے گورنر کی ملازمت میں رہنے والے ایک ترکی غلام سبکتگین نے 986 میں قائم کیا تھا۔

غزنی کے ترکی حکمراں سبکتگین کے لیے ہندوستان کی دولت کشش کا باعث تھی۔ اس نے 990 میں ہندوستانی سرزمین پر پہلا حملہ کیا اور 991 میں جے پال کی فوجوں کو شکست دے کر پشاور پر قبضہ کرلیا۔ اس ذلت کی وجہ سے جے پال نے خودسوزی کرلی۔

997 میں سبکتگین کی موت ہوگئی۔ اس کے بیٹے محمود غزنوی نے ہر سال ہندوستانی میدانوں پر حملہ کرنا اپنا شعار بنا لیا۔ وہ اکتوبر مہینے کے قریب ہندوستان میں داخل ہوتا اور گرمیاں شروع ہونے سے قبل وافر مال غنیمت کے ساتھ غزنی واپس لوٹ جاتا۔ ہزارویں برس کے موقعے پر جے پال کے بیٹے انند پال نے اجین، گوالیر، کلنگ، قنوج، دہلی اور اجمیر کے حکمرانوں سے ایک معاہدہ کیا اور محمود کی فوجوں سے مقابلہ کرنے کے لیے پشاور کے نزدیکی میدانوں میں ایک بڑی فوج جمع کرلی۔ لیکن انند پال کے ہاتھی پاگل ہو گئے۔ اتحادی افواج میں زبردست دہشت پیدا ہوگئی۔ اس کے نتیجے میں ایک زبردست تباہی ان کے سامنے تھی۔ اب محمود نے اور آگے کی طرف پیش قدمی کی۔ اس بار اس نے کانگڑا کے مندر کو اپنا نشانہ بنایا جس میں بے شمار دولت تھی۔ جو خزانے وہ یہاں سے لے گیا ان میں ایک سفید چاندی کا مکان تھا جس کی لمبائی 30 گز اور چوڑائی 15 گز تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ساتھ ڈھیر سارے جواہرات، موتی اور یاقوت بھی لے گیا۔ زمرد جو حنا کی تازہ پتیوں کی طرح تھے اور ہیرے جن کا سائز اور وزن انار کے برابر تھا۔ ہندو مندروں میں بے پناہ دولت موجود تھی اور محمود ان سب کو اور مورتیوں کو بھی برباد کرتا گیا، اس وجہ سے نہیں کہ وہ ہندو مخالف تھا بلکہ اس غیر معمولی دولت کی وجہ سے جو ان عبادت گاہوں میں موجود تھی۔ خلیفہ کے تئیں اس کا احترام بہت معمولی تھا۔ دراصل، اس نے اس پر طنز کیا تھا۔ اور یہ بھی ایک کم اہم بات نہیں ہے کہ اس نے غزنی کے ایک ہندو جنرل راجہ تلک کی سپہ سالاری میں ایک فوج تیار کی تھی جس نے اپنے مالک کے دو معرکوں میں وسط ایشیا کے مسلم حکمرانوں کے خلاف جنگ کی۔ وہ ملتان اور وسط ایشیا میں اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ بھی اسی شدت کے ساتھ لڑا۔ اس نے اپنی سلطنت کو آج کے افغانستان، پاکستان اور ایران کے ایک بڑے حصے اور ٹرانس آکسیانا (Trans oxiana) تک پھیلا دیا تھا۔

اس نے پنجاب کو فتح کیا۔ کشمیر نے کسی طرح اس کی پیش قدمی کو روکا اور اسے پیچھے ڈھکیل دیا۔ 1018 میں اس نے دوبارہ ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس مرتبہ اس نے پہلے بلند شہر اور پھر متھرا کا رخ کیا جو ایک ایسے مندر کے لیے جانا جاتا تھا جس میں سونے کی پانچ مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ محمود غزنوی یہ سب اپنے ساتھ لے گیا۔ محمود نے قنوج پر بھی حملہ کیا جس کے راجا راج پال نے اتنے بزدلانہ طریقے سے ہتھیار ڈال دیئے کہ اس کے پڑوسی بندیل کھنڈ کے چنڈالوں نے اسے قتل کردیا، جنھیں خود بھی محمود کے ذریعے شکست حاصل ہوئی۔

واپسی کے سفر میں محمود کاریگروں اور باکمال معماروں کی ایک بڑی تعداد اپنے ساتھ لے گیا تاکہ وہ اس کے دارالحکومت غزنی کو دنیا کے سب سے خوبصورت شہروں میں سے ایک اور علم وفن کا ایک عظیم مرکز بنانے میں اس کی مدد کریں۔ جس وقت اس نے اس دنیا کو خیرباد کہا اس نے اپنی دارالحکومت کو لاتعداد خوبصورت عمارتوں سے سجا دیا جو فن، مساجد اور کتب خانوں کے عظیم خزانوں سے آراستہ تھیں۔ اکثر بڑے سپاہیوں کی طرح وہ تعلیم یافتہ لوگوں کی سوسائٹی کو پسند کرتا تھا۔ شاہنامہ کا عظیم خالق فردوسی بھی اس کا درباری شاعر تھا۔

محمود کے ذریعے لے جائے گئے کثیر مال غنیمت نے اس کی اشتہا کو اور بڑھا دیا۔ 1023 میں ایک بار پھر اس نے 30,000 گھوڑ سواروں کے ساتھ غزنی سے کوچ کیا اور ملتان میں داخل ہوا جہاں ایک مسلم سردار کی حکومت تھی، اس نے اپنے ہم مذہب کو شکست دی اور مال غنیمت پر قبضہ کیا۔ اب اس نے راجستھان کے ریگستان کو عبور کرنے کے لیے اونٹوں کی بڑی فوج تیار کی اور فوراً ہی بیکانیر، اجمیر اور انہل واڑ کے لیے کوچ کیا۔ پھر کاٹھیاواڑ کی غیر معمولی دولت سے مالا مال مندر پر حملہ کیا۔ ایک طویل محاصرے کے بعد وہ وہاں کے باشندوں کی مزاحمت پر قابو پانے میں کامیاب ہوا۔ یہاں سے جو خزانہ وہ سمیٹ کر لے گیا اس کی قیمت تقریباً دو ملین دینار تھی۔ یہاں تک کہ اس نے سومناتھ کے مندر کے آرائشی دروازوں اور مورتی کے ٹکڑوں کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ لیکن واپسی کے سفر میں راجپوتوں کے ہاتھوں اسے زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کے۔ ایم۔ منشی اپنی کتاب "The Glory that was Gujrat Rashtra" میں ایک دلچسپ تفصیل پیش کرتے ہیں جس کے مطابق "شاہ محمود مایوس ہو کر بھاگا اور اپنی

جان بچائی، لیکن اس کے اکثر ساتھیوں کو جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے، قید کر لیا گیا۔ ترک، افغان اور مغل قیدی عورتیں جو کنواری تھیں، ہندوستانی فوجیوں نے انھیں اپنی زوجیت میں لے لیا۔ قیدی عورتوں کی ان کے برابر کے مرتبے والے لوگوں سے شادی کر دی گئی۔ کم رتبے والی عورتیں ادنیٰ درجے کے آدمیوں سے منسوب کر دی گئیں۔ قابل احترام مردوں کو ان کی داڑھیاں مونڈنے پر مجبور کیا گیا اور پھر ان کا شمار راجپوتوں کے شیخاوت اور رداوھیل قبائل میں کیا گیا جبکہ ادنیٰ درجے کے لوگوں کو کولس، کھانتا، باہریا اور میو ذاتوں میں رکھا گیا۔ بہر حال، یہ ہندوستان پر محمود غزنوی کا آخری حملہ تھا۔ اس کے بعد، وہ کبھی واپس نہیں آیا۔

1030 میں محمود کا انتقال ہو گیا۔ اس کے جانشیں اپنی ذاتی لڑائیوں میں اس قدر مشغول تھے کہ اگلے پچاس برسوں تک ہندوستانی میدانوں نے سرحد پار کے حملوں سے راحت کی سانس لی۔ جب کہ راجپوت ریاستیں اپنی فوجوں کو مستحکم کر رہی تھیں، غزنی کو اب برے دنوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک چھوٹی ریاست غور کے حکمراں محمد شہاب الدین نے غزنی کی طرف پیش قدمی کی اور اسے نذر آتش کر دیا۔ شہر سات دنوں اور سات راتوں تک جلتا رہا، راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ اور سبکتگین کے جانشینوں کو اسی طرح تلوار کے زور پر باہر کر دیا گیا جس طرح سے وہ اقتدار میں آئے تھے۔ یہ دراصل قسمت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ غزنی کے عظیم فاتح محمود کے جانشینوں کو لاہور میں پناہ لینی پڑی۔

دوسرے حملہ آوروں کی طرح محمد شہاب الدین بھی ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا جس کی شناخت ایک ایسے ملک کی حیثیت سے تھی جو سونے اور قیمتی نگینوں سے بھرا ہوا تھا۔ جہاں ایسے پودے تھے جو پوشاک بنانے کے کام آتے تھے،، جہاں خوشبودار نباتات اور گنے تھے۔ ملک کا پورا تصور خوشگوار اور فرحت بخش تھا۔ اس نے سترہ بار ہندوستان پر حملہ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا پہلا معرکہ 1175 میں ملتان کے مسلم حکمراں کے خلاف تھا جسے اس نے شکست دی اور کثیر مالِ غنیمت کے ساتھ واپس لوٹا۔ 1178 میں وہ دوبارہ آیا۔ لیکن اس مرتبہ معرکہ گجرات کے خلاف تھا۔ اس کی فوج بری طرح شکست سے دوچار ہوئی، اور وہ جلد بازی میں واپس لوٹا۔ اس کے فوج کی صرف ایک ہی ٹکڑی باقی بچی اور وہ بھی بہت خستہ حالت میں تھی۔ وہ اگلے برس پھر واپس آیا اور پیشاور پر قبضہ کر لیا۔ دو برسوں کے بعد اس نے ایک بار پھر حملہ کیا اور سیالکوٹ میں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ اس بار اس نے جموں کے ہندو راجا کے ساتھ ایک معاہدہ کیا اور محمود غزنوی کے مسلم وارث پر حملہ کیا جو لاہور پر حکومت کر رہا تھا، اس نے اپنے ہم مذہب پر فتح حاصل کی اور غزنوی کے آخری وارث کو قیدی بنا کر غزنی لے گیا اور اسے قتل کر دیا۔

پنجاب پر محمد شہاب الدین کے تسلط نے اسے ستلج کے کناروں پر لا کھڑا کیا۔ اس نے اسے 1190 میں عبور کیا اور بھٹنڈا پر قبضہ کیا، پھر پرتھوی راج چوہان کی سلطنت دہلی اور اجمیر کے ایک حصے پر قابض ہوا۔ جیسے ہی محمد شہاب الدین نے پیش قدمی کی، پرتھوی راج نے اس سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی فوجوں کو آگے بڑھایا۔ وہ کروکشیتر (پانی پت) کے تاریخی میدان جنگ کے قریب ترائن (Tarain) میں آمنے سامنے ہوئے۔ یہ 1190-91 کی سردیوں کی بات ہے، پرتھوی راج نے غوری حکمراں کی فوجوں کا زبردست مقابلہ کیا اور انھیں بری طرح پسپا کر دیا۔ شہاب الدین خود بھی زخمی ہوا اور میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن راجپوتوں نے اس کا تعاقب نہیں کیا اور محمد شہاب الدین نے غزنی میں پناہ حاصل کی۔

شکست کی ذلت میں جلتے ہوئے اس نے راجپوتوں کو سبق سکھانے کی قسم کھائی۔ اس طرح اگلے برس 1192 میں وہ دوبارہ ایک بڑی فوج کے ساتھ آیا اور اسی میدان جنگ میں اپنی فوج ترتیب دی۔ اس بار ستارے موافق تھے۔ کیونکہ ہندوستانی حکمرانوں کے مابین نفاق نے راجپوتوں کو کمزور کر دیا تھا، یہاں تک کہ قنوج بھی الگ ہو گیا تھا۔ اس کا الزام پرتھوی راج پر جاتا ہے جس نے قنوج کے جے چند کی بیٹی کا اغوا کر لیا تھا یہی وجہ تھی کہ جے چند اس کا جانی دشمن بن گیا تھا۔

پرتھوی راج کو شکست ہوئی۔ اسے اور اس کے بھائی کو میدان جنگ میں ہی قتل کر دیا گیا۔

ترائن کی یہ دوسری جنگ فیصلہ کن ثابت ہوئی اور اس نے ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ محمد غوری دوبارہ ہندوستان آیا اور اجمیر کی طرف کوچ کیا، جو چوہانوں کا پایۂ تخت تھا۔ اس نے اجمیر شہر کو تاراج کر دیا، پرتھوی راج کے بیٹے کو اپنا وائسرائے مقرر کیا اور محمد غوری بے شمار لوگوں کو قیدی بنا کر لے گیا۔

غوری کا سب سے زیادہ قابل اعتماد اور لائق جنرل قطب الدین ایبک تھا، جو ایک ترکی غلام تھا جسے غور حکمراں نے اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے خریدا تھا۔ اس کے کام سے خوش ہو کر محمد غوری نے اسے غور کے اصطبلوں کا حاکم مقرر کیا۔ ایبک نے اپنے مالک کے اعتماد کو استناد بخشا اور ہندوستانی معرکوں میں اپنی ذمے داریوں کو بخوبی نبھایا۔ جب محمد غوری غزنی واپس لوٹا تو اس نے ایبک کو شمالی ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا۔ ایبک نے پیش قدمی کی اور ہانسی، دہلی، میرٹھ اور رنتھمبور کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

1194 میں محمد شہاب الدین کی فوجوں نے قنوج کے جے چند کو شکست دی جو لڑتے ہوئے مارا گیا۔ راجپوتوں نے راجستھان کی طرف ہجرت کی اور جودھپور میں اپنی سلطنت قائم کی۔ تین برسوں کے بعد ایبک نے گجرات کو فتح کیا۔ 1202 میں وہ بندیل کھنڈ کے اندر تک گیا، بدایوں گیا اور پھر اپنی

دارالحکومت دہلی لوٹ آیا۔

محمد غوری کا ایک اور جنرل محمد بن بختیار تھا جس نے بہار کو فتح کیا اور نالندہ اور وکرم شلا کی عظیم جامعات اور ان کی وسیع لائبریریوں کو تباہ و برباد کر دیا اور تمام بودھ بھکشوؤں کو نیست و نابود کر دیا۔ ان میں سے محض چند ہی زندہ بچ سکے جنھوں نے اپنی بعض کتابوں کے ساتھ تبت میں پناہ لی۔ اس کے بعد محمد بن بختیار نے بنگال کی طرف کوچ کیا اور اسے فتح کیا۔

1200 تک راجپوتانہ، مالوا اور گجرات کے علاقوں کے علاوہ، پورا شمالی ہند محمد غوری کے جنرلوں کے قبضے میں تھا۔ پانچ برسوں کے بعد، محمد غوری کو شاہِ خراسان کے ہاتھوں ایک زبردست شکست ہوئی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ غزنی میں داخل ہونا بھی اس کے لیے دشوار ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں اس کی فتوحات خطرے میں تھیں، جہاں ایک غزنوی نے ملتان پر دوبارا قبضہ کر لیا تھا۔ اس لیے محمد غوری اپنی ریاستوں میں ہونے والی بغاوتوں اور خاص طور سے پنجاب کے کھوکھروں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے ہندوستان کی طرف بڑھا لیکن واپسی کے سفر میں سندھ ندی کے کنارے پر اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کی لاش کو غزنی لے جایا گیا جہاں اس کی تدفین ہوئی۔

محمد غوری کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے، اس کی موت کے بعد اس کے وائسرائے شاہی عہدے کے وارث تسلیم کیے گئے۔ ان میں سب سے مقدم، قطب الدین ایبک دہلی سلطنت کا پہلا مسلم سلطان ہوا۔ اس نے غزنی میں بھی اپنے پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن اسے بھاگ کر لاہور میں پناہ لینی پڑی۔ اس کے بعد سے، ایک طویل عرصے تک قطب الدین ایبک کے جانشینوں کو ہندوستان تک ہی محدود رہنا پڑا۔ 1210 میں پولو کے کھیل کے ایک حادثے میں ایبک کی موت واقع ہو گئی۔ کسی طرح اس کے خاندان نے 1290 تک حکومت کی جس کے بعد خلجیوں نے تیس برس تک حکومت کی، اور پھر 68 برسوں تک دہلی کے تخت پر تغلق خاندان کی حکومت رہی، اس کے بعد لودھی آئے جنھیں بابر نے 1526 میں پانی پت کے میدان میں شکست دی اور مغل حکومت قائم کی۔

مترجم کا پتہ:
355, Jhelem Hostel, JNU, New Delhi. □□□

جامع انگریزی-اردو لغت (حصہ اوّل تا ششم)

مدیرِ اعلیٰ: کلیم الدین احمد

☆ محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہل علم و قلم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرّہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اردو لغت ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ و اصطلاحات و معانی کا احاطہ کرتی ہے۔

☆ یہ لغت دنیا کے کسی بھی موضوع پر انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات فراہم کرنے میں آپ کی مدد کرے گی۔

☆ تمام مروج علوم وفنون سے متعلق انگریزی/اردو الفاظ و اصطلاحات کا ایک جامع ذخیرہ۔

☆ مترادفات، محاورات اور تشریحات سے مزین اپنی نوعیت کی پہلی مستند، وقیع اور ضخیم لغت جو ویبسٹر کو بنیاد بنا کر تیار کی گئی ہے۔

☆ اردو زبان میں نئے سائنسی تصورات اور نئی علمی جہتوں کے اضافے کے ساتھ۔

☆ اکیسویں صدی کے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ ....

☆ دو سو سے زائد سائنسی و سماجی علوم و فنون پر محیط ....

☆ امریکی / برطانوی انگریزی کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ ....

☆ قومی اردو کونسل کا ایک یادگار کارنامہ ....ایک تاریخی دستاویز، بڑا سائز 11.5x911 ۔ عمدہ کاغذ، بہترین طباعت......

........کمپیوٹرشدہ کتابت مضبوط و مطلا جلد..........صفحات: حصہ اوّل (1217، قیمت:-/400)، حصہ دوم (1062، قیمت:-/600)، حصہ سوم (1091، قیمت:-/600)، حصہ چہارم (866، قیمت:-/600)، حصہ پنجم (1042، قیمت:-/600)، حصہ ششم (1012، قیمت:-/600)

براہ راست طلب فرمائیں یا کسی کتب فروش سے خریدیں۔

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

کرشن چندر

غسلیات

بہت سے بچوں کا نفسی تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نہانے کی رسم پتھر کے زمانے بلکہ اس سے بھی بہت پہلے زمانے کی یادگار ہے۔ جب کہ اس کرۂ ارض پر صاف پانی ہی پانی تھا۔ آہستہ آہستہ اس پانی میں مچھلیاں، مینڈک، گھڑیال اور مگر مچھ پیدا ہوئے اور تخلیقِ حیات کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے مختلف انواع کے ارتقائی درجوں کے بعد انسان کی موجودہ صورت کو پہنچے۔ چنانچہ آج بھی بیسویں صدی کا بچہ جب ٹب میں پڑے پڑے چلا اٹھتا ہے تو یقیناً پانی کے ٹھنڈے ہونے کی شکایت نہیں کرتا بلکہ اس آبی زمانے کی وحشی رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے جس کے نام سے ڈارون کا نام ہمیشہ کے لیے وابستہ ہے۔

اس زمانے میں بہت سی پرانی وحشیانہ رسمیں متروک ہو چکیں مگر نہانے کے متعلق ابھی کچھ عرصے اور جہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میرے بہت سے احباب جو اس قابلِ نفریں رسم کے خلاف جہاد کرتے کرتے تنگ آ چکے ہیں اور بہت پر امید نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کہ جب تک پنجاب میں پانچ دریا بہتے رہیں گے، انسان بدستور ان میں نہاتے اور گھڑیال، مگر مچھ اور خوفناک بھنوروں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ یہاں میں ان لوگوں کا تفصیل سے ذکر کرنا نہیں چاہتا جو غسل خانوں میں نہاتے ہیں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پنجاب میں، جہاں متوسط طبقے کے لوگ کافی تعداد میں ہیں، ہر دو ہزار افراد کے لیے صرف ایک غسل خانہ دستیاب ہو سکتا ہے اور بعض اضلاع میں تو تناسب کا یہ فرق بہت بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ محکمۂ دیہات سدھار کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہوشیار پور میں ایک بھی غسل خانہ نہیں۔

لیکن میں اپنے احباب کے نقطۂ نگاہ کو درست نہیں سمجھتا۔ میں مستقبل کے متعلق اس قدر ناامید نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا عقیدہ محض ایک نام نہاد رسمی رجائیت کے فلسفے پر مبنی ہو لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں یاسیت اور تذبذب میں پڑے ہوئے دلوں نے آج تک کچھ نہیں کیا اور پھر میرے پاس تو پر امید ہونے کے لیے بہت سی وجہیں ہیں۔ انھیں بالتفصیل بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

(1) اس سیاسی خلفشار کے زمانے میں لوگوں کو غسل سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ نہانا ایک انفرادی فعل ہے اور فسطائیت یا اشتراکیت ہر دو مقبول، عمومی فلسفے انفرادیت کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔

(2) جوں جوں ''تہذیب'' بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ انسان کو پانی سے نفرت ہوتی جا رہی ہے اور نہانا تو محض اب نچلے درجوں کی پسماندہ جماعتوں کے لیے رہ گیا ہے۔ ورنہ شائستہ اور مہذب لوگ تو صرف ڈرائی کلین ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کنویں پر نہاتے ایک پوربئے کا دوسرے پوربئے سے کہنا۔ ''ارے یار تو نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔'' ذرا خیال کیجیے کتنا یتیم، غریب افلاس زدہ فقرہ ہے۔ خودداری، بلند حوصلگی اور تہذیب سے قطعاً عاری۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی یہ بتا دے کہ وہ دن کے کتنے بجے نہاتا ہے۔ تو میں یہ وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لیے ابھی اسے کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(3) مثال کے طور پر:

صبح چار بجے کون نہاتا ہے؟۔ پوربیا، بنیا، میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا مہتر۔

صبح 6 بجے، ڈاکیہ، دفتر کا بابو، پولیس کا سپاہی۔

8 بجے، پروفیسر، کالج کا لڑکا۔

10 بجے منسٹر، مجسٹریٹ، رئیس اعظم۔

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے۔ اگر آپ پہلے غسل کرتے وقت آدھ، پون، گھنٹہ صرف کرتے تھے تو اب صرف دو منٹ پر آ جائیں گے۔ اگر پہلے سارے جسم کو بار بار پانی میں ڈبوتے تھے تو اب صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کو تر کر کے ''نہانے'' سے فارغ ہو جاتے ہیں اور میں تو اس مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں جب لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کریں گے اور پھر فخریہ لہجے میں اپنے احباب سے ذکر کیا کریں گے کہ لو بھئی آج ہم ''نہائے'' اور یقیناً جس طرح ہندوستان کو سوراج حاصل ہوگا اسی طرح وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے جب کہ نہانے کی رسم اس ہندوستان، جنت نشان سے قطعاً مٹ جائے گی۔ صرف کہیں کہیں جس طرح آج کل بعض راسخ الاعتقاد ہندو سنیچر کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا منہ دیکھ لیتے ہیں۔ بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے ہفتہ روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کریں گے اور نہایت غرور سے کہا کریں گے۔'' آج تو ہم نے غسل کر لیا۔ کتنی مدت

کے بعد آج پانی میں منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانے کو، آج کل لوگ نہاتے بھی نہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہفتے میں ایک دن ہمارے سارے سارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں۔ اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے۔ مگر ہمارے دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگو لیا کرتے تھے (ایک جھرجھری لے کر) واہ واہ اس نہانے میں بھی کیا مزہ ہوگا۔"

غسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں۔ بدن صاف رہتا ہے اور جی ہلکا پھلکا رہتا ہے۔ کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا۔ میں خود اپنی پچیس سالہ تجرباتی زندگی کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ راوی میں نہانے سے مسام کھلتے نہیں۔ بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر غلطی سے راوی کا دو گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض و غایت یہی تھی۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہو جاتا ہے اور رنگ نکھر آتا ہے تو سائنٹیفک نقطۂ نگاہ سے اسے بھی غلط سمجھنا چاہیے۔ نہانے کے فی الفور بعد بدن چست نہیں ہوتا بلکہ سکڑ جاتا ہے۔ باقی رہا رنگ کا نکھرنا۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرتا تو جنوبی ہندوستان کے باشندے کب کے گورے بن چکے ہوتے اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا رنگ سفید ہوتا۔ مگر اس کے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے۔ وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم تھے۔ ان کے جسم اس قدر کمزور تھے کہ اکثر وہ ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے۔ مبادا ہوا کا کوئی تیز و تند جھونکا انہیں اڑا کر لے جائے۔ وہ ہر صبح اٹھ کر اپنے پھونس کے جسموں کو دیکھتے اور قدرت کی کاریگری پر حیران ہوتے جس نے ان کو ابھی تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ کوئی دن بھر کلائی پکڑے نبض ٹٹولتا رہتا۔ کوئی اپنے پتلے کاغذ جسم پر ہاتھ پھیرتا اور سوچتا کہ یا الٰہی اس جسد خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہوا ہے؟

ان کی سات بیویاں تھیں۔ موٹی، بانجھ اور بدصورت بیویاں، وہ سب کی سب اس قدر کریہہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی یہ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔ ہو نہ ہو میرے اس بھائی کی عورت میری بیوی سے قدرے اچھی ہے۔ اگر "وہ" مجھے مل جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم قطعاً متروک ہو چکی تھی۔ بھائی تو اس خیال سے نہیں نہاتے تھے کہ پانی میں تحلیل کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کہیں وہ نہاتے نہاتے پانی میں بالکل حل ہی نہ ہو جائیں اور بیویوں کو اس خیال سے نہیں نہانے دیتے تھے کہ دریائے تاپتی میں گھڑیال بہت رہتے ہیں۔ جو یقیناً موٹے جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کریں گے۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال ابھارا کہ اسے ضرور نہانا چاہیے۔ چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب گھڑیال دریا کے کنارے ریت پر پڑے سوتے تھے۔ دریا پر گئی اور نہا کر واپس لوٹ آئی۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اپنے سیاہ بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب چمک تھی اور اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

جب بھائیوں نے اسے دیکھا تو بیتاب ہو گئے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ یہ میری بیوی ہے۔ نہیں یہ میری بیوی بنے گی۔ اسے میں لوں گا، اسے میں لوں گا۔ گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپا تک پہنچی۔ لگتا تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جاں بحق ہو گئے اور بیویاں بیوائیں بن گئیں۔ اور جب گھڑیالوں کو یہ خبر ملی تو تاپتی کے کنارے سے رینگ رینگ کر آئے اور ساتوں بیواؤں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھونس کا بڑا سا جھونپڑا پڑا ہے، جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی یہ ہولناک صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

"اسے میں نہ دوں گا۔ اسے میں نہ دوں گا۔ یہ میری ہے، یہ میری ہے۔"

نتیجہ: نہانا اخلاقی جرم ہے۔

آخر میں آپ استفسار کریں گے تو یہ سولہ آنہ درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے۔ اسے ملیامیٹ کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ اس کے خلاف پرزور پروپیگنڈہ کیا جانا چاہیے۔ مگر صاحب یہ تو سب وقتی، رسمی اور ہنگامی باتیں ہیں۔ آخر آپ کا پروگرام کیا ہے؟ بغیر پروگرام کے آج کل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی، لگے ہاتھوں وہ بھی سن لیجیے:

(1) جو امیر شخص نہائے اسے سماج سے باہر نکال دیا جائے (2) دفعہ 144 (الف) میں یہ ایزاد کیے جائیں۔ ہر گاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ...... جو شخص غریب ہلوہ کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائے گا، اسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائے گا۔

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ گنگو میرے سامنے میز کا کنارہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا — "بابو جی! غسل خانے میں پانی دیر سے دھرا ہے۔ آپ جلدی نہا لیں ورنہ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔" میں قلم چھوڑ کر میز کی دراز سے ایک تولیہ نکال کر یہ شعر گنگناتا ہوا غسل خانے کی طرف بھاگ گیا۔

جو نہاؤ گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

□□□

راہی شہابی

ایک لمحہ

یہ لمحہ ایک یہ لمحہ گزر گیا جو ابھی
بس ایک لمحے میں بھولا ہوا فسانہ ہے
یہ لوٹ کر نہ کبھی آئے گا قیامت تک
ہر ایک لمحہ اسے دور ہوتے جاتا ہے

ہے وقت ایک سمندر کہ جس کی تھاہ نہیں
کہ جس پہ تیر رہا ہے یہ عالم امکاں
کروڑوں سال ہیں جس کی تہوں میں بکھرے ہوئے
وہ جس میں ڈوب چکی ہیں ہزار ہا صدیاں

یہ لمحہ وقت کے بیکراں سمندر میں
بہت ہی چھوٹے سے قطرے کی شکل رکھتا ہے
مگر یہ قطرہ تلاطم کی بے پناہی میں
ہر ایک موج کی مانند دخل رکھتا ہے

میں سوچتا ہوں یہ لمحہ ابھی جو گزرا ہے
اس ایک لمحے میں کیا کیا نہ ہوگیا ہوگا
پرانے کتنے درختوں کو سرنگوں کرکے
یہ لمحہ کتنے نئے بیج بو گیا ہوگا

کسی سے آکے ملا ہوگا کوئی بچھڑا ہوا
کسی سے مل کے کوئی پھر بچھڑ گیا ہوگا
کسی کی قسمتِ برہم سنور گئی ہوگی
کسی کا بن کے مقدر بگڑ گیا ہوگا

کسی کے ذوقِ عمل کو کچل کے دنیا نے
ہر ایک عزم کو ناکام کردیا ہوگا
کسی غریب نے تنگ آکے اپنی غیرت کو
خود اپنے ہاتھوں سے نیلام کر دیا ہوگا

اس ایک لمحے میں دنیا کے کونے کونے میں
چراغ کتنے جلے ہوں گے اور بجھے ہوں گے
براتیں کتنی اسی لمحے میں چڑھی ہوں گی
جنازے کتنے اسی لمحے میں اٹھے ہوں گے

دلوں سے چھین کے خوشیاں اس ایک لمحے نے
دلوں میں غم کے سمندر سمو دیے ہوں گے
وہ لوگ پھولوں پہ چلنے کی جن کو عادت تھی
انھی کے پاؤں میں کانٹے چبھو دیے ہوں گے

غرض کہ ایک اسی لمحے پہ منحصر کیا ہے
کروڑوں ایسے تو لمحے گزر چکے اب تک
گرے جو وقت کے دامن سے مثلِ لعل و گہر
وہ لمحے دامنِ تاریخ بھر چکے اب تک

میری نظر میں ہے اس وقت وہ ہر اک لمحہ
کہ جس نے جلوۂ تاریخ کو نکھارا ہے
دلوں کو گرمیِ عزم و عمل سے گرما کر
حیات کو نئے انداز سے سنوارا ہے

میں سوچتا ہوں وہ عالم کہ جب نہ تھا کچھ بھی
نہ چاند تارے نہ سورج نہ آسماں نہ زمیں
ہر ایک سمت عدم کی سیاہیوں کے سوا
نہ تھا وجود کا موجود کوئی نقشِ حسیں

جو ہے فسانۂ عالم کا نقطۂ آغاز
جو بن کے لمحۂ بے مثل و بے مثال آیا
مری مراد وہ لمحہ وہ ایک لمحہ کہ جب
خدائے پاک کو تخلیق کا خیال آیا

وہ ایک لمحہ کہ کُن کی صدا اٹھی ہوگی
خمیدہ گیسوئے فطرت سنور رہے ہوں گے
اسی عدم کے ورق پر پڑا تھا جو سادہ
وجود کے نئے خاکے ابھر رہے ہوں گے

وہ ایک لمحہ کہ آدم سے جب ہوئی سرزد
وہ ایک لغزشِ اوّل وہ اک خطائے حسیں
کہ جس سے ہوگئی روشن یہ کارگاہِ حیات
یہ مہر و ماہ یہ انجم، یہ آسماں، یہ زمیں

وہ ایک لمحہ کہ سقراط کی دلیری نے
کہانیوں کو حقیقت بنا دیا ہوگا
ضمیر و فکر کی عظمت کے نام پر اس نے
لبوں سے زہر کا پیالہ لگا لیا ہوگا

وہ ایک لمحہ کہ جب قتل گاہ کی جانب
قرار خاطر و نور نظر کو لے کے چلے
پئے ثبوتِ وفا تیغ آب دار کے ساتھ
خلیل اپنے ہی لختِ جگر کو لے کے چلے

وہ ایک لمحہ کہ جس لمحہ حضرتِ عیسٰی
بہ صد شکوہ سوئے دار بڑھ گئے ہوں گے
جھکا کے ظلم کو مظلومیت کے قدموں پر
سکون و صبر سے سولی پہ چڑھ گئے ہوں گے

وہ ایک لمحہ کہ تکمیلِ فرض کی خاطر
یہ رنج دل پہ بصد یاس لے لیا ہوگا
یہ جان کر بھی کہ میرا قصور کوئی نہیں
خوشی سے رام نے بن باس لے لیا ہوگا

وہ ایک لمحہ کہ سیتا کی پاک دامانی
ہر امتحان پہ تیار ہوگئی ہوگی
وہ آگ جس کو جلاتا تھا دامنِ سیتا
وہ آگ دامن گلزار ہوگئی ہوگی

وہ ایک لمحہ کہ غارِ حرا کی تاریکی
تجلیات میں تبدیل ہوگئی ہوگی
جو داستانِ نبوت تھی نا تمام اس کی
اس ایک لمحے میں تکمیل ہوگئی ہوگی

چراغ عظمتِ انسانیت کے پہلی بار
جہاں جہاں بھی اندھیرا تھا جل اٹھے ہوں گے
اس ایک لمحے میں تاریخِ آدمیت کو
ورق ورق نئے عنوان مل گئے ہوں گے

دہک رہے تھے جو آتش کدوں میں دنیا کے
وہ شعلے ظلم و شقاوت کے بجھ گئے ہوں گے
شگفتگی رخِ مفلس پہ چھا گئی ہوگی
ستارے قیصر و کسریٰ کے کانپ اٹھے ہوں گے

وہ ایک لمحہ کہ جب تین دن کے پیاسے نے
زمینِ کرب و بلا کے دہکتے ذرّوں پر
بڑے جلال سے اک فیصلہ کیا ہوگا
جو اب بھی کندہ ہے تاریخ کے نگینوں پر

وہ ایک لمحہ کہ زینبؑ نے اپنے بیٹوں کو
اس اعتماد سے رن پر رواں کیا ہوگا
کہ ایسا تحفہ کسی بھائی کو زمانے میں
کسی بہن نے یقیناً نہیں دیا ہوگا

اُداس لوگوں کی آنکھوں میں دیکھ کر آنسو
غموں سے چور تڑپتے دلوں کی سن کے پکار
وہ ایک لمحہ کہ نانک نے جب کہا ہوگا
مجھے دُکھی نظر آتا ہے ہائے سب سنسار

وہ ایک لمحہ کہ جب پدمنی کی غیرت نے
وفا کو مائلِ تکمیل کر دیا ہوگا
اور اس نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے جسم کو خود
جلا کے راکھ میں تبدیل کر دیا ہوگا

وہ ایک لمحہ کہ جب ذہن کے اندھیروں میں
ہر ایک سمت اُجالا بکھر گیا ہوگا
اور اس کے ساتھ ہی معمار تاج کے دل میں
خیالِ تاج محل کا گزر ہوا ہوگا

وہ ایک لمحہ کہ ٹوٹا نپولین کا غرور
کہا تھا اس نے کہ کچھ بھی نہیں ہے ناممکن
اسی کے ہاتھ سے میداں میں گر گئی تلوار
اس کی آنکھوں نے دیکھا شکستِ فاش کا دن

وہ ایک لمحہ کہ ٹیپو سے سرفروش نے جب
یہ طے کیا رہوں تابندہ میں زمانے میں
فسانہ جب بھی لکھا جائے سرفروشی کا
تو میرا نام بھی شامل ہو اس فسانے میں

وہ ایک لمحہ کہ شاہ ظفر نے دلی سے
ہجومِ یاس میں قصدِ سفر کیا ہوگا
تڑپتے دل سے بڑی بے بسی میں آخری بار
نظر کو جانبِ دیوار و در کیا ہوگا

وہ ایک لمحہ کہ رنگون میں ظفر کو جب
خیال آیا کہ دل کی کوئی کلی نہ کھلی
یہ بدنصیبی کی حد ہے کہ دفن کی خاطر
دیارِ یار میں دو گز زمین بھی نہ ملی

وہ ایک لمحہ کہ جب خاک و خوں میں لتھڑے ہوئے
ظفر کے بیٹوں کے سر اس کے روبرو آئے
کہا ظفر نے بڑے فخر سے کہ مرکر بھی
ہمارے سامنے آئے تو سرخرو آئے

وہ ایک لمحہ کہ حضرت محل نے آنچل کو
وطن کے واسطے پرچم بنا لیا ہوگا
تڑپ کے لکشمی میداں میں آگئی ہوگی
اور اس نے ہاتھ میں خنجر اٹھا لیا ہوگا

وہ ایک لمحہ کہ جب طے کیا یہ گاندھی نے
خلیج ظلم و تشدد کی پاٹ دی جائے
پڑی ہوئی ہے جو ہندوستاں کے قدموں میں
وہ اب غلامی کی زنجیر کاٹ دی جائے

وہ ایک لمحہ کہ جس لمحے میں بھگت سنگھ نے
شہید ہونے کا بیڑا اٹھا لیا ہوگا
وطن کے نام پہ اس سرفروش نے خود ہی
گلے میں پھانسی کا پھندا لگا لیا ہوگا

وہ ایک لمحہ کہ اشفاق نے یہ ماں کو لکھا
کسے خبر ہے جوانی رہے، رہے نہ رہے
وطن پہ جان لٹاؤں گا نوجوانی میں
کہ پھر لہو میں روانی رہے، رہے نہ رہے

وہ ایک لمحہ کہ آوازِ شاعرِ مشرق
اٹھی تو قوم کا پیکر سنور گیا ہوگا
سنا جو نالۂ اقبال سونے والوں نے
تو ان کا نشۂ غفلت اتر گیا ہوگا

وہ ایک لمحہ کہ سطحِ قمر پہ پہلے پہل
قدم اک آدمِ خاکی کا جب پڑا ہوگا
جنوں کی جرأتِ وارفتہ جھوم اٹھی ہوگی
خرد نے شرم سے سر کو جھکا لیا ہوگا

وہ ایک لمحہ کہ عبدالحمید نے سوچا
کہ آج شیخ و برہمن کی آبرو رکھ لوں
بہا کے اپنا لہو مادرِ وطن کے لیے
جو لٹ رہی ہے وہ گلشن کی آبرو رکھ لوں

غرض کہ بس انھی لمحوں پہ منحصر کیا ہے
افق پہ ایسے تو لمحے ہزاروں ابھریں گے
مگر میں دیکھ رہا ہوں اب ایک وہ لمحہ
کہ جس کے بعد یہ لمحے کبھی نہ گزریں گے

اور اب میں پھر اسی لمحے کی بات کرتا ہوں
وہ لمحہ ایک وہ لمحہ ابھی جو گزرا ہے
یہ لوٹ کر نہ کبھی آئے گا قیامت تک
ہر ایک لمحہ اسے دور ہوتے جاتا ہے

اسی زمیں پہ اسی آسمان کے نیچے
اس ایک لمحے میں کیا کیا نہ ہوگیا ہوگا
پرانے کتنے درختوں کو سرنگوں کرکے
یہ لمحہ کتنے نئے بیج بو گیا ہوگا

تاریخ تحریک آزادیٔ ہند

مصنف: تاراچند

ہندستان کی تحریک آزادی کی ایک مبسوط تاریخ جو ڈاکٹر تاراچند جیسے مورخ نے قلم بند کی ہے۔ جلد اول میں یورپ میں نیشنلزم کا ارتقا، مغلیہ سلطنت کے زوال، جلد دوم میں 1857 سے لے کر 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام، جلد سوم میں 1885 سے تحریک عدم تعاون اور چوتھی جلد میں 1918 سے 1947 تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

(مکمل سیٹ: چار جلدوں میں)

صفحات: 2728، قیمت-/794 روپے

آثار الصنادید (مکمل تین جلدوں میں)

مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم

سید احمد خاں کی اس مشہور کتاب میں دلی کے آثار قدیمہ کے علاوہ مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیتوں کا بھی ذکر ہے جس سے کتاب کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن 1847 میں شائع ہوا تھا، یہ تحقیقی ایڈیشن اسی پہلے ایڈیشن کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے اور گزشتہ ڈیڑھ سو برسوں کی دستبرد سے جو آثار قدیمہ محفوظ رہ گئے ہیں ان کی موجودہ حالت بھی اس میں بیان کردی گئی ہے۔

صفحات: 1138، قیمت:-/717 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے %40 کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

حیات افتخار

ڈی. جے. کانتن — ایک تعارف

گیان پیٹھ ایوارڈ، ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی اعزاز ہے جو ہمارے ملک کے آئین کی رو سے منظور شدہ اٹھارہ زبانوں میں سے کسی ایک زبان کے بلند پایہ ادیب یا شاعر کو ہر سال دیا جاتا ہے۔ یہ ایوارڈ ڈھائی لاکھ روپے کی نقد رقم اور توصیفی سند پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا آغاز 1969 میں کیا گیا اور یہ اعزاز سب سے پہلے ممتاز اردو شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو حاصل ہوا۔ تمل زبان کے صرف دو ادیبوں اکیلن اور جے. کانتن کو یہ ایوارڈ ملا ہے۔ 1975 میں اکیلن کو ان کے معرکۃ الآرا ناول "چترا پاوائی" کے لیے یہ ایوارڈ دیا گیا تھا جس کا اردو ترجمہ حسرت سہروردی نے "تصویر بتاں" کے نام سے کیا اور جسے نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کیا تھا۔ اکیلن کو جب یہ ایوارڈ دیا گیا تھا اُس وقت موجودہ گیان پیٹھ انعام یافتہ تمل ادیب ڈی. جے کانتن کا نام بھی جیوری کے زیر غور تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈی. جے کانتن نے آج سے تیس سال قبل ہی تمل ادب میں اعلیٰ مقام پیدا کر لیا تھا۔ ڈی. جے کانتن کو تیس سال کے طویل انتظار کے بعد اس سال ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں اس اعلیٰ اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

ڈی. جے کانتن کی پیدائش تمل ناڈو کے ایک ساحلی قصبے کڈلور میں 2 مئی 1932 میں ہوئی۔ ان کا تعلق ایک زراعت پیشہ خاندان سے تھا۔ انھوں نے باقاعدہ طور پر تعلیم پانچویں درجے تک ہی حاصل کی لیکن دنیا کے مشاہدے اور زندگی کے تجربات سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ تلاش معاش میں انھیں در بدر کی خاک چھاننی پڑی اور اس کے لیے انھوں نے کئی پیشے اختیار کیے۔ انھوں نے پنسے کی دوکان میں کام کیا، آٹا پیسنے کی مشین چلائی۔ چھاپے خانے میں کمپوزنگ کی، فلمی گانوں کی کتابیں فروخت کیں، فونڈری کے انجن میں کوئلہ جھونکا، صابن اور روشنائی بنانے کے کارخانے میں کام کیا، کسی پریس میں پروف ریڈنگ بھی کی اور ایک رسالے کے نائب مدیر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اس طرح انھوں نے عام آدمی کی زندگی اور اس کے مسائل کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ ان تجربات کی بھٹی میں تپ کر اُن کا فن بھی کندن بن گیا۔

ڈی. جے کانتن نے اپنا تخلیقی سفر بیس سال کی عمر میں شروع کیا۔ ان کی پہلی کہانی "سو باکیئم" نامی رسالے میں شائع ہوئی۔ ان کی ابتدائی تخلیقات "سمرن" نامی تمل رسالے میں شائع ہوئیں جس کے مدیر عصمت بادشاہ تھے۔ انھوں نے اس رسالے کے نائب مدیر کے فرائض بھی انجام دیے۔

اپریل 1954 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "آنم پینم" (مرد اور عورت) اور ستمبر 1954 میں دوسرا مجموعہ "اُدیم" (طلوع) منظر عام پر آیا۔ ان کے ذریعے انھوں نے تمل افسانوی ادب میں خود کو نہ صرف متعارف کروایا بلکہ اپنی انفرادیت کا سکّہ بھی جمایا۔

ان کی جملہ تصانیف کی تعداد تقریباً پچاس ہے جن میں پندرہ افسانوی مجموعے شامل ہیں جو دو سو سے زائد افسانوں پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بیس ناول اور ناولٹ لکھے ہیں۔ ڈی. جے کانتن نے ڈرامے اور مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔ تمل افسانوی ادب میں دو افسانہ نگاروں کے نام بہت نمایاں ہیں۔ ان میں ایک پدومائی پٹن ہیں اور دوسرے ڈی. جے کانتن۔ ان دونوں نے تمل افسانے کو ایک نیا لہجہ، ایک نئی جہت اور نئی معنویت عطا کی۔ پدومائی پتن کو تمل میں بابائے افسانہ کی حیثیت ہے۔ اور انھوں نے اپنی مختصر عمر میں تمل زبان میں شاہکار افسانے لکھے۔

دوسرے پیش رو فنکار ڈی. جے کانتن گذشتہ نصف صدی سے تمل افسانوی ادب کے دامن کو وسیع کر رہے ہیں۔ انھوں نے موجودہ زندگی کے مسائل کو موضوع بناتے ہوئے ایک عام انسان کو اپنی کہانی کا ہیرو بنایا۔ انھوں نے اس عام انسان کے دکھ درد اور خوشی و مسرت کی داستان کو دلآویز اسلوب میں بیان کیا۔ ڈی. جے کانتن کی کہانیاں عوام و خواص دونوں میں یکساں مقبولیت رکھتی ہیں۔

ڈی. جے کانتن کے افسانوں کے موضوعات متنوع ہیں ان کی تخلیقات کی بنیادی صفت انسان دوستی ہے جو ان کی ہر تحریر سے مترشح ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے ان کے انقلابی طرز فکر سے بھی آگاہی ہوتی ہے ان کے افسانوں میں ظلم اور نا انصافی، ذات پات اور اونچ نیچ کے امتیازات کے خلاف زبردست احتجاج ملتا ہے۔

اُن کی ایک کہانی کا عنوان ہے "پگل پاسنجری ونڈی" (دن کی مسافر ریل گاڑی) جس میں انھوں نے ایک ایسی برہمن عورت کے کردار کو پیش کیا ہے جو مرتے وقت اپنے بچے کو ایک نیچ ذات کے شخص کے سپرد کر جاتی ہے۔ اس موقع پر وہ یہ بھی وصیت کر جاتی ہے کہ وہی شخص اس کی آخری رسومات بھی ادا کرے۔

"پرما اُبدیسم" (اعلیٰ درجے کی نصیحت) میں ڈی. جے کانتن سماج کے ناسور کی جراحی کر کے اس کا علاج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کہانی میں پیدائش کی بنیاد پر اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والے ایک کردار کے ذریعے اونچ نیچ کے تصور کو مسترد کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اونچی ذات سے وابستہ اعلیٰ اخلاق کا حامل یہ کردار ایک نیچ ذات کہلانے والے کے گلے میں زنّار باندھتے ہوئے کہتا ہے کہ "تو ہی برہمن ہے۔"

"تالاٹو" (لوری کے گیت) میں ایک ایسی جوان عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جسے ایک عمر رسیدہ شخص سے شادی کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور وہ شادی کی پہلی رات پہلی بیوی کے دودھ پیتے بچّے کو لوری کے گیت سنا کر سُلانے میں گزارتی ہے۔ ایک مثالی ہندوستانی عورت کی طرح وہ نہ صرف بچے کی ماں کا فرض نبھاتی ہے بلکہ بیوی کی ذمے داری بھی خوبی سے نبھاتی ہے۔

ڈی. جے کانتن نے اپنی بعض کہانیوں میں انسانوں کے بے سر و پا اور عجیب و غریب رویّے کی بھی عکاسی کی ہے۔ "ترسنگو سورگم" ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنی بھرپور جوانی کو ضائع کرنے کے بعد سینتیس سال کی عمر میں ایک ذہنی تبدیلی سے دوچار ہوتی ہے جس کے باعث وہ اپنے ہی ایک شاگرد سے شادی کر لیتی ہے۔

ڈی. جے کانتن ایک ایسے بے خوف اور نڈر ادیب ہیں جو اپنی بے لاگ حقیقت نگاری کے لیے کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ افسانہ "اگنی پرویسم" (آگ میں داخلہ) اُن کی اسی خصوصیت کا عکاس ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار گنگا نامی ایک لڑکی ہے جسے ایک دولت مند شخص اپنی کار میں لفٹ دینے کے بہانے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے جب وہ لڑکی اپنے گھر لوٹتی ہے تو اس کی ماں کسی غصّے کا اظہار کیے بغیر خاموشی سے اسے نہلا دھلا کر اگنی پوجا کرنے کے بعد اس واقعے کو بھول جانے کی نصیحت کرتی ہے۔ اس کہانی کا یہ اختتام ایک عرصے تک تمل ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا رہا۔ ڈی. جے کانتن نے اس کے بارے میں کہا کہ میں ایک افسانہ نگار ہوں۔ میں صرف کہانی لکھتا ہوں اور کہانیوں کی اپنی ایک منطق ہوتی ہے۔ کہانی کار گلی کوچوں میں تماشہ دکھانے والا نہیں کہ وہ ہر ایک کو خوش کرتا پھرے۔

ان کی یہ کہانی ان کے افسانوی مجموعے "سو یہ درسنم" میں شامل ہے جو 1967 میں شائع ہوا تھا۔ ان کی کہانیوں کا ایک انتخاب "ڈی. جے کانتن کی کہانیاں" کے نام سے نیشنل بک ٹرسٹ کے زیر اہتمام مختلف زبانوں میں شائع کیا گیا۔ اس میں بھی یہ کہانی شامل ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مذکورہ کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک ناول لکھا جس کا عنوان تھا "سلانیر نگلل سلا میندر گل" (بعض اوقات بعض انسان)۔ جس میں انھوں نے کہانی کی ہیروئن گنگا کو پھر اسی شخص سے دوبارہ ملتے ہوئے دکھایا ہے جو اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا چکا ہے۔ وہ شادی شدہ شخص ہے، سماجی روایات کے مطابق وہ اُس سے شادی تو نہیں کر سکتی لیکن اس سے وہ ایک ذہنی اور روحانی رشتہ قائم رکھنا چاہتی ہے۔ زندگی کا وہ ایک لمحہ جو اس کی زندگی میں بحران پیدا کر دیتا ہے وہ اس کا بوجھ اٹھاتے ہوئے اپنی بقیہ زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ہندوستانی سماج میں عورت ایسے حالات میں کس صورت حال سے دوچار ہوتی ہے اور اپنی بقیہ زندگی گزارنے میں اسے کن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا بہترین اظہار اس کہانی میں ہوا ہے۔

ڈی. جے کانتن ایک ہمہ جہت تخلیقی فن کار ہیں۔ کبھی وہ مارکس کے معاشی نظریات سے متاثر ہوئے ہیں تو کبھی فرائڈ کی نفسیاتی گتھیوں میں الجھے۔ انھوں نے گاندھیائی فلسفے کا بھی اثر قبول کیا ہے۔ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ ہمیں دشمن کو ختم نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کی قلب ماہیت کرنی چاہیے۔

وہ ادیب کی سماجی ذمے داریوں کے قائل ہیں۔ ڈی. جے کانتن کے کئی افسانوں اور ناولوں پر فلمیں بھی بنیں جو باکس آفس پر ناکام ہونے کے باوجود تمل آرٹ فلموں میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی تخلیقات پر مبنی فلموں میں "سلانیر نگلل سلا میندر گل" (بعض اوقات بعض انسان)، یار کا گے الودان (کسی کے لیے رویا؟) اور پدو سر یو کذکیم (نیا چپل کاٹے گا) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

انھوں نے اپنی تخلیقات میں انقلابی طرز فکر کا حامل ہونے کے ساتھ ایک سچے فنکار ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اپنے فن کے ذریعے انفرادی احساسات کو بیدار کرتے ہوئے سماجی تبدیلی کے جذبے کو ابھارا ہے۔ آج جب کہ ان کی عمر ستر سال سے زائد ہے ان کے قلم کی رفتار کافی دھیمی پڑ چکی ہے۔ اس سلسلے میں ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا ہے کہ جس طرح انھیں لکھنے کی پوری آزادی حاصل ہے اسی طرح ان کو نہ لکھنے کی بھی آزادی ملنی چاہیے۔

اس سے قطع نظر کہ وہ آگے لکھیں یا نہ لکھیں لیکن اب تک انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے ہر تخلیق اپنے اندر خاص کشش رکھتی ہے۔ اپنی ان تخلیقات کی بنیاد پر انھیں تمل افسانوی ادب کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور وہ بلا شبہ ہندوستانی ادب کی تاریخ کے چند مایہ ناز فن کاروں میں شمار کیے جائیں گے۔

Quaide Millat College,
Medawakam,Chennai - 601302

□□□

ایلگن لارسن — ہماری مطبوعات — "تاریخ ایجادات" سے اقتباس

ٹیلی ویژن

پرانے زمانے کے قصے کہانیوں میں انسان کی پوشیدہ خواہشات کا جس قدر بھی اظہار ہوا ہے، اسے سائنس نے اب حقیقت میں بدل دیا ہے، ان میں سب سے اہم ٹیلی ویژن ہے۔ گذشتہ نسل کے لوگ یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ٹیلی ویژن کے مثل خیالی منصوبہ کبھی حقیقت بھی بن سکتا ہے۔ وہ لوگ بدکار شہزادیوں، مکار جادوگروں، اور شاطر ساحروں کو جانتے تھے اور پرانی کہانیوں میں انھوں نے اکثر پڑھ بھی رکھا تھا کہ شیشوں پر دور بیٹھے لوگوں کی تصویر بلا لی جاتی ہے۔ لیکن یہ کس کو خیال ہوسکتا تھا کہ آج ہم اپنے کمروں میں بیٹھے صرف ایک سوئچ کو گھما کر دور دراز کی تصویر اپنے پاس بلا سکتے ہیں۔

بجلی سے تصاویر کی ترسیل کرنے کا خیال شاید اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ برقی ٹیلی گراف۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک نوجوان ماہر نفسیات الکزنڈر بین نے ایک مشین کا منصوبہ تیار کیا اور پانچ برس بعد بیکول نے ایسی مشین بنائی جس کے ذریعے برقی تار سے خاکے ترسیل کیے جاسکتے تھے۔ موجودہ زمانے کی فوٹو ٹیلی گرافک سے اس کی بہت مناسبت ہے۔ اس میں ایک ٹرانسمٹر میں ایک اسطوانہ ہوتا ہے اور دوسرا ریسور میں اور دونوں ہمہ وقت ایک ہی رفتار سے گھومتے ہیں۔ ٹرانسمٹر میں اسطوانہ کے گرد دھات کی ایک پتلی چادر گھری ہوتی ہے جس میں خاکہ کو روشنائی سے بنایا جاتا ہے۔ جب یہ سلنڈر گردش کرتا ہے تب گراموفون کی طرح ایک پک اَپ میں لگی ہوئی ہلکے سے دھات کی چادر کو چھوتی ہے اور اس کی لمبائی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ سوئی سے ایک تار مٹی کی ایک طشتری اور سلنڈر کی بیٹری سے ہوتا ہوا ریسیور تک جاتا ہے۔ جب سوئی روشنائی کو چھوتی ہے تب سلنڈر کی چال رک جاتی ہے۔ ریسیور میں سلنڈر کے گرد ایک کاغذ لپٹا ہوتا ہے اس میں کیمیاوی مادہ لگا ہوتا ہے جب سوئی روشنائی کو چھوتی ہے تو الکٹرولائیٹک حرکت کے ذریعے کاغذ پر رنگ آجاتا ہے۔ چنانچہ کاغذ پر خاکے کا حصہ سفید رہتا ہے لیکن بقیہ حصے پر رنگ غالب ہوتا ہے۔

نصف صدی کے بعد ایک جرمن ماہر طبیعیات آرتھر لورن نے فوٹوالکٹرک کو الکٹروکیمکل پر ترجیح دیتے ہوئے اس نظام میں جدت پیدا کردی۔ فوٹو ٹیلی گرافی کا یہ طریقہ، خواہ تار کے ذریعے ہو یا لاسلکی کے ذریعے، اب بھی فوٹوگراف، دستاویز وغیرہ ترسیل کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ 1950 کے بعد امریکی ریڈیو کمپنیاں مکمل اخبار کو تیز رفتار فوٹو ٹیلی گرافی کے ذریعے ترسیل کرنے لگیں۔ اس کی وجہ سے اخبار چھاپنے اور تقسیم کرنے کا کام ختم ہوگیا۔ انگریز انجینئروں کا خیال ہے کہ وہ چھپے ہوئے الفاظ کو معمولی ٹیلی فون کے ذریعے بھی ترسیل کرسکتے ہیں یا طلوع صبح ٹیلی ویژن کے ذریعے سارے اخبار کو پڑھنے والے کے گھر ترسیل کیا جاسکتا ہے۔ اخبار کو پڑھنے والے کے گھر پہنچانے کا طریقہ بہت مہنگا ہے۔ اور جب تک کم قیمت پر بھاری تعداد میں ریسیور نہ بننے لگیں اس وقت تک اخبار کو تقسیم کرنے کے لیے پرانا طریقہ ہی اپنانا ہوگا۔ امریکہ میں 1959 میں ڈاک کے حکام نے خط ترسیل کرنے کے لیے فیکس میل کا طریقہ اپنایا۔ اس میں 1800 الفاظ فی منٹ کی رفتار سے دور دور تک ترسیل کیے جاسکتے ہیں۔ ڈاک کے حکام کا کہنا ہے کہ اس طرح خط بھیجنے کا طریقہ ہوائی جہاز کے ذریعے خط بھیجنے سے بہت سستا ہے۔

اس صدی کے آغاز میں جب لوگ فوٹو ٹیلی گرافی کی حقیقت سے روشناس ہوگئے تب یہ یقین ہو چلا کہ چلتی پھرتی تصویروں کو بھی ترسیل کرنا ممکن ہے۔ درحقیقت مسئلہ صرف رفتار کا تھا۔ یعنی مناظر یا حرکتوں کو دیکھنا، پھر اس منظر کو لہروں کے ذریعے ریسیور تک بھیجنا، ان لہروں کو جلد از جلد اکٹھا کرنا تاکہ دیکھنے والے کو گمان ہو کہ درحقیقت مناظر اور حرکتیں زندگی کے صحیح نمونے ہیں۔ جس طرح سنیما میں فلم کے فریم ہماری آنکھوں کے سامنے اتنی تیزی سے

● ابتدائے آفرینش سے دورِ حاضر تک انسانی زندگی مسلسل تغیّر و تبدّل سے ہمکنار ہوتی رہی ہے۔ انسان اپنے ذہن و فکر سے کام لے کر ہمیشہ اپنے لیے آسانیاں فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ چنانچہ آگ اور کھیتی کی ایجاد نے جہاں کھانے میں آسانی اور خطرناک جانوروں سے تحفظ فراہم کیا وہیں پہیے نے رسل و رسائل میں آسانی بہم پہنچائی۔ ان ابتدائی ایجادوں سے تحریک پاکر انسان نے منصوبہ بند طریقے سے سوچنا شروع کیا اور نتیجے میں نئی نئی ایجادات سامنے آئیں۔ "تاریخ ایجادات" میں بھاپ کے انجن، بجلی، جوہری توانائی، پانی جہاز، ہوائی جہاز، تار پیغامات، ریڈیو، تصویر اور دیگر حیرت انگیز ایجادات کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ 398 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/162 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

گزارے جاتے ہیں کہ حرکات اور مناظر مسلسل معلوم ہوتے ہیں اسی طرح امید تھی کہ آنکھ کی یہ خوبی ٹیلی ویژن میں بھی حرکات اور مناظر کو مسلسل بنادے گی۔

مناظر کو دیکھنے، انھیں لہروں سے بھیجنے اور پھر انھیں جلد اکٹھا کرنے کا طریقہ پہلے پہل 1883 میں پال نپکو کی سمجھ میں آیا۔ برلن یونیورسٹی کا یہ طالب علم دو ترقیوں سے بہت متاثر ہوا۔ اول تو ٹیلی فون کی ایجاد اور دوسرے یہ انکشاف کہ غیر معدنی عنصر سلی نیوم پر جب سورج کی روشنی پڑتی ہے تو اس سے برقی لہریں آزادی سے پار ہوتی ہیں۔ چنانچہ نپکو نے کارڈ بورڈ کی پتلی گول تھالی بنوائی جس کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ پھر ایک کیمرہ بنوایا جس کے اندر یہ پتلی گول تھالی جو موٹر سے چلتی تھی، لگادی۔ اس کے بعد اس نے کیمرہ کو منظر کے سامنے رکھ دیا۔ ایک تیز روشنی کی شعاعیں گردش کرتی ہوئی تھالی کے سوراخوں سے گزر کر منظر پر پڑتی تھیں۔ اس طرح منظر کو تیز روشنی یا مدھم روشنی کے نقطوں میں تقسیم کردیا گیا۔ تھالی کی ایک گردش میں منظر کی ہر تفصیل آجاتی تھی۔ بیٹری اور ریسیور سے ملحق ایک روشنی سے متاثر سیل منظر کو مسلسل برقی لہروں کی شکل میں ترسیل کرتا تھا۔ اس سے ایک بلب میں ٹمٹماہٹ ہوتی تھی۔ ایک دوسری تھالی جس میں ویسے ہی سوراخ تھے، کی مدد سے تیز روشنی اور مدھم روشنی کے نقطوں کی شکل میں پھر منظر کو اکٹھا کیا جاتا تھا۔

نپکو نے اپنی ایجاد کو ''الکٹریکل ٹیلی اسکوپ'' کے نام سے پیٹنٹ کروایا۔ لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ فنی اور تکنیکی مسئلے اتنے پیچیدہ تھے کہ انھیں سلجھانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی ایجاد کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا اور ریل کا انجینئر بن گیا۔

الکٹرونکس کے انکشاف کے بعد دوسرے موجدوں کو ٹیلی ویژن کے پیچیدہ مسئلوں کو حل کرنے کے لیے ایک نیا طریقہ مل گیا۔ کروکس کے ایجاد کیے ہوئے کیتھوڈ رے ٹیوب میں اسٹراس برگ یونیورسٹی کے پروفیسر فرڈیننڈ براون نے بہت ترقی کی۔ پروفیسر براون نے ٹیوب سے نکلتے ہوئے کیتھوڈ رے کو نظر کے سامنے کردیا۔ وہ اس طرح ہوا کہ اس نے اپنے مخروطی شکل والے ٹیوب کے دوسرے طرف چوڑے کنارے کے اندر فلور سنٹ ایملشن مل دیا۔ اس کے بعد 1905 میں جرمنی کے دو سائنس داں جولیس السٹر اور ہانس گیٹل نے ایک جلد اثر پذیر ہونے والے فوٹو الکٹرک سیل کی ایجاد کی۔

سنٹ پیٹرس برگ ٹیکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر بورس روزنگ شاید پہلے شخص تھے جنھوں نے براون کے بنائے ٹیوب کی تصویروں کو عیاں کرنے کے لیے استعمال کیا۔ 1907 میں پروفیسر روزنگ نے یہ مشورہ دیا کہ دور کے برقی منظر ہوں جس میں نپکو کی بنائی ہوئی تھالی سے منظر دیکھا جائے اور منظر کو کیتھوڈ رے ٹیوب پر نظر کے سامنے لایا جائے۔ اسی دوران ایک انگریز موجد کیمپبل سوئٹن نے بھی الکٹرونک ٹیلی ویژن کا مشورہ دیا۔ لیکن کیمپبل کے خیال میں تصویر کو ارسال کرنے اور پھر اسے اکٹھا کرنے کے لیے کیتھوڈ رے ٹیوب استعمال کیے جانے چاہیے۔ اس نے اپنے خیالات کو 1908 میں ایک پرچے میں شائع کیا اور پھر 1911 اور 1920 میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ اس طرح ارسال کی ہوئی تصویروں کو پھر توڑا اور پھر اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔ 1909 میں میونخ کے ایک انجینئر میکس ڈکمین نے بھی اس امر پر ایک مضمون لکھا اور ٹیلی ویژن کا ایک چھوٹا نمونہ بھی بنایا۔

ٹیلی ویژن کے مسئلوں کا پہلا کارآمد حل اتفاقیہ مل گیا۔ اگرچہ یہ حل جان لوگی بیرڈ اسکاٹ لینڈ کے پادری کا لڑکا تھا۔ وہ عالم گیر جنگ سے قبل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کررہا تھا لیکن خرابی صحت کی بنا پر اس کی تکمیل نہ کرسکا۔ جان نے معاشی دشواریوں پر قابو پانے کے لیے طرح طرح کی تجارت کی۔ کبھی لندن میں فرانسیسی صابن کا کاروبار کیا تو کبھی ترینیداد میں مارکلیڈ بنایا لیکن قسمت نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ آیا زندہ رہنے کے لیے نئے طرز کے بلیڈ کو عوام میں مقبول بنائے یا ٹیلی ویژن کی ایجاد کرے۔ بے پناہ دشواریاں جھیلنے کے باوجود اس نے فیصلہ ٹیلی ویژن کے حق میں لیا۔

اسکاٹ لینڈ کے اس نوجوان نے ٹیلی ویژن جیسی صدی کی دشوار ترین ایجاد میں کامیابی حاصل کرنے کی جو کوشش کی اس کی بہت کم مثال ملتی ہے۔ جان نے انتہائی قلاشی اور اپنے سے پہلے کے ماہرین کے کاموں سے لاعلمی کے باوجود ایک چھوٹے سے کمرے میں تجربہ کرنا شروع کیا۔ پانی کے بیسن کو اس کے آلات میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ چائے کا لکڑی کا ایک بکس، کباڑی سے خریدا گیا ایک موٹر، کارڈ بورڈ سے بنائی گئی نپکو طشتری، شیشوں کے چند ٹکڑے، ملٹری کا ازکار رفتہ لاسلکی ٹیلی گراف، ٹارچ کی بیٹری، سینے کی سوئی، ایک دوسرے سے دھاگے سے مربوط تھے اور کمرے میں چہار طرف تار ہی تار پھیلا ہوا تھا۔

بیرڈ اس جستجو کی بدولت انسانی چہرے کے دھندھلے سے خاکے کو تین چار میٹر ترسیل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بیرڈ تجربے میں اس درجہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد سوہو کی فرتھ اسٹریٹ کے مکان نمبر 22 میں منتقل ہوگیا۔ یہاں پر لندن کے ایک بہت بڑے تاجر نے اس کی حیرت ناک ایجاد کو دیکھا اور بیرڈ کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ دکان کے برقی آلات کے شعبے میں

خریداروں کو دن میں دو تین بار یہ کرشمہ دکھائے۔ بیرڈ کو روٹی میسر نہیں تھی اس لیے اس نے بحالت مجبوری نوکری کر لی لیکن جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا کہ نصف ایجاد کا لوگوں کی دلچسپی کی خاطر مظاہرہ سود مند نہیں رہے گا اور اس کی ایجاد تکمیل تک نہیں پہنچ پائے گی۔ چنانچہ اس نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ بیرڈ 12 راکتوبر 1925 کو پہلی بار انسانی چہرے کے نقوش کو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ترسیل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بیرڈ جس دکان میں رہتا تھا اس کے نیچے کی منزل کی دکان کا چپراسی وہ پہلا شخص تھا جسے ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ بیرڈ نے چند ماہ بعد اپنی ایجاد کو سائنٹفک سوسائٹی کے ممبروں اور اخبار نویسوں کو دکھلایا۔ ایجاد سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور اس کے افادی پہلو کے مدنظر ایک کمپنی کی بنیاد رکھی گئی۔

بیرڈ کے ٹیلی ویژن میں چوں کہ تصویر لینے کا نظام اور تصویر کو دوبارہ ترتیب دینے کا طریقۂ کار میکانکی تھا اس لیے اس میں بہت سی خامیاں تھیں۔ بیرڈ نے اسکیننگ کے مقصد سے ٹرانسمیٹر میں نپکو ڈسک کا استعمال کیا اور ابتدا میں ریسیور کو فراہم کی جانے والی برقی رو کو فوٹو الکٹرک سیل سے تار کے ذریعے ماڈولیٹ کیا۔ بعد میں یہ کام وائرلس سے لیا جانے لگا۔ روشن شعاع ریسیور میں موصول ہونے والے سگنل کے مطابق ماڈولیٹ ہوتی اور ایک دوسری نپکو ڈسک سے ہوکر ٹرانسمیٹر کی ڈسک کے مطابق حرکت کرتی اور گزر کر اس اسکرین پر پڑتی۔ یہ سلسلہ تیس لائن کے بعد ایک مخصوص سگنل میں تال میل کی خاطر تبدیل ہوجاتا جس کے سبب پوری تصویر تشکیل ہوتی اور پردے پر بنتی۔ بیرڈ نے تصویر کو مزید بہتر بنانے اور خدوخال کو واضح کرنے کی غرض سے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور وائرلیس کی مدد سے تصویر کو دور تک ترسیل کرنے کی خاطر تگ و دو شروع کر دی۔ بیرڈ کی یہ خواہش تھی کہ بی بی سی اس کے نظام پر تجربہ کرے لیکن بی بی سی میں ایسے بااثر حلقے موجود تھے جو کہ بیرڈ کی دریافت اور نظام کو ناپسند کرتے تھے بلکہ ٹیلی ویژن کے مخالف تھے اور 1929 میں آخرکار پارلیمنٹ کے حکم سے مجبور ہوکر بی بی سی نے تجرباتی طور پر ٹیلی ویژن کی ترسیل کا کام شروع کیا۔

انگلینڈ میں یہ سب کچھ جس وقت ہو رہا تھا امریکہ میں ٹیلی ویژن کے الکٹرانک نظام میں بڑی سرعت سے ترقی ہو رہی تھی۔ امریکہ میں دو سائنس دانوں میلوٹی فارنس ورتھ اور اس کے حریف ڈاکٹر وی کے زورکن نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ زورکن نے روس میں جو کہ اس کا وطن تھا تعلیم پائی تھی اور سینٹ پیٹرس برگ میں بورڈ روزنگ کی ماتحتی میں کیتھوڈ شعاعوں پر 1910 سے کام کرنا شروع کیا اور دو سال کے بعد جب ان لوگوں کو یقین ہوگیا کہ نپکو ڈسک کے میکانیکی نظام اور بران ٹیوب کے الکٹرانک طریقۂ کار میں باہمی ربط نہیں پیدا کیا جاسکتا ہے تو تجربے کو رد کر دیا۔ ان لوگوں نے اس مختصر مدت میں جو کچھ کیا وہ کام کی نوعیت کے حساب سے بہت اہم ہے لیکن اس کے باوجود دونوں ماہرین اس حقیقت کو سمجھ گئے کہ ٹیلی ویژن کے لیے الکٹرانک نظام بہت اہم تھے اور لازمی۔ تجربے کی نوعیت سے 1919 کا سال بہت اہم ہے جب کہ زورکن نے امریکہ میں سکونت اختیار کر لی اور دوبارہ کام شروع کیا۔ زورکن نے 1928 میں آئی کانسکوپ نامی آلہ کے سلسلے سے اپنے حقوق محفوظ کرانے کی درخواست دی۔ یہ آلہ ٹیلی ویژن پر تصویروں کی اچھی اور بہتر ترسیل میں انقلاب لے آیا اور آج بھی الکٹرانک ٹیلی ویژن کیمرے میں بنیادی اختراع کا درجہ رکھتا ہے۔

زورکن کو کیمرہ کی تشکیل میں ریڈیو کارپوریشن آف امریکہ کے تعاون کی وجہ سے وسائل کی کوئی کمی نہ تھی۔ زورکن کا کیمرہ انسانی آنکھ سے الکٹرانک بدل کا درجہ رکھتا ہے۔ کیمرے کا عدسہ جو کچھ دیکھتا وہ اس کا عکس ویکیم ٹیوب میں ایک ڈسک پر مرتب کرتا جس پر روشنی سے متاثر ہونے والی چاندی کی گرہیں تھیں۔ یہ گرہیں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے باوجود انسولیٹڈ اور ایک دوسرے سے الگ تھیں۔ کیمرے سے عکس جب گرہوں پر پڑتا تو روشنی کی کثرت قلت کے حساب سے اس میں برقی چارج پیدا ہوتا اور عکس برقی نوعیت اختیار کر لیتا۔ اب ٹیوب کے کیتھوڈ سے برقیروں کی ایک پتلی شعاع جب موزیک پر پڑتی تو ہر لائن کی گرہ کا یکے بعد دیگرے فی سیکنڈ چوبیس مرتبہ کی رفتار سے جائزہ لیتی۔ اس کے علاوہ جیسے ہی شعاع گرہ پر پڑتی وہ اس کے برقی چارج کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتی۔ یہ چارج ٹرانسمیٹر کی لہروں کو ماڈولیٹ کرنے کا کام انجام دیتا۔ یہ لہریں ریسیور کے لیے عکس کو وائرلس ایلس کی طرح ترسیل کرتیں۔ ریسیونگ سیٹ کے بڑے کیتھوڈ ٹیوب کو قلب کا درجہ حاصل ہے۔ یہ ٹیوب ایک سرے پر چوڑی ہوتی ہے جس کے اندر کی سطح روشنی خارج کرنے والے زنک سلفائڈ سے قلعی کی ہوتی ہے اور یہ مثل پردے کے کام کرتی ہے جس پر تصویر بنتی ہے۔ وائرلیس امپلس اس کے علاوہ کیتھوڈ میں ہیجان کا باعث ہوتی ہے۔ اور برقیروں پر مبنی ایک شعاع نکلتی ہے جو کہ رفتار میں کیمرہ کی شعاع کے مثل ہوتی ہے۔ باہمی تال میل کا نظام بیرڈ جیسا ہے اور ہر لائن کے خاتمے پر مخصوص سگنل دیا جاتا ہے۔ برطانیہ کے ٹیلی ویژن نظام میں 405 لائنیں ہیں لیکن امریکہ اور براعظمی نظام میں 805 تک لائین ہیں۔ 1928 میں فلوٹی ٹرانسورتھ نے اکیلے موجد کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے تصویر کی قطع و برید کے لیے ایک دوسرا ہی نظام بنایا۔ 1930 میں دو

دوسرے امریکی سائنسدانوں موجود نے روز اور ایام نے "آرتھی کان" کی ایجاد کی۔ اس ایجاد نے ٹیلی ویژن کیمرے کو اس درجہ حساس بنادیا کہ وہ موم بتی کی روشنی میں بھی بخوبی کام کرسکتا ہے۔ اسی دوران ریڈیو پکچر اور ٹیلی ویژن کے لیے صوتی امپلس کی ترسیل کے لیے بلند تواتر کی ترسیل ہائی فری کوئنسی ٹرانسمیشن کا طریقہ اپنایا گیا اور ہمہ گیر پیمانے پر ٹرانسمیشن کی سہولتیں نہ ہونے کے باوجود ہم مداری کیبل (کوایکویل کیبل) سے ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کو ایک دوسرے سے مربوط کردیا گیا اور ترسیل کی رینج چند میل ہونے کے باوجود پروگرام پورے ملک میں بخوبی دیکھا جاسکا۔

لندن کے الکو نڈر پیلیس سے دو نومبر 1936 سے ٹیلی ویژن پروگرام کا مستقل آغاز ہوا اور بیرڈ اور زورکن طریقہ کار میں سے کون زیادہ بہتر ثابت ہوتا ہے۔ اس کو جاننے کے لیے دونوں نظام کو ایک ہفتے کے وقفے سے یکے بعد دیگرے استعمال کیا گیا۔ بیرڈ کا نظام 240 لائنوں کے بعد کامیاب نہ ہوسکا اور چند ہفتوں کے بعد اسے ترک کردیا گیا اور اس کی جگہ الکٹرانک نظام کو ترجیح دی گئی۔ برطانیہ کا ٹیلی ویژن خدمات کو دوسری عالمی جنگ کے دوران بند کردیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لہریں جہاز کے لیے لندن کی سمت آمد میں معاون تھیں، اور جون 1946 میں اس کی تجدید کی گئی۔ جان لوگی بیرڈ کا چند دن بعد 58 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ جان لوگی بیرڈ نے اپنے نظام کے رد کردیے جانے پر اپنے فطری دکھ پر قابو پانے کے بعد رنگین ٹیلی ویژن پر کام شروع کردیا تھا کیوں کہ اس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک اس کی مانگ ہوگی۔

امریکہ میں ٹیلی ویژن کی ابتدا یوں تو جنگ کے دوران ہوچکی تھی لیکن لڑائی ختم ہونے پر جب بڑی بجلی کی فرموں نے رسیور کثرت سے بنانے شروع کیے تبھی اس کا فروغ صحیح معنوں میں ہوسکا اور 1960 تک یہ صورت ہوگئی کہ جو پروگرام علاقائی اسٹیشنوں سے ترسیل کیے جانے والے اہم نوعیت کے ہوتے ان کو ملک کی دو تہائی آبادی بخوبی دیکھ لیتی۔ کان سے جو کچھ آدمی سنتا ہے اس کے مقابلے میں آنکھوں سے دیکھے جانے والے پروگرام انسان کو زیادہ متاثر کرتے ہیں اس لیے موجودہ دور کی جمہوریت میں اس کو زیادہ مقام حاصل ہے اور اچھے اور برے دونوں ہی طریقے سے یہ اپنے دیکھنے والے کو بخوبی متاثر کرسکتا ہے۔ ٹیلی ویژن سیاسی رہنماؤں کو چاہے وہ مرد ہو یا عورت افراد کے ڈرائنگ روم میں لے آتا ہے اور سیاست داں جو الیکشن جیسی جنگ لڑتے ہیں ان کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے اور غیر ذمے دار لوگوں کو اس کے ذریعے بڑی خوبی سے بے نقاب کیا جاسکتا ہے۔ یہ دنیا کے اہم واقعات میں شامل ہونے کا موقعہ فراہم کرتا ہے اور کامیاب تھیٹر، فلم کو دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ یہ بے شک تضیع اوقات کا باعث بھی ہے اور گھسے پٹے مذاق، لطیفے اور ڈاکوؤں پولس کی لڑائی دیکھنے کو ملتی ہے یا پردے پر پیش کی گئی اشیا کو ہمیں مجبوراً خریدنا پڑتا ہے۔ ٹیلی ویژن ایک ایسی ایجاد ہے جس نے انسان کی تکنیکی کامیابی کے مقابلے میں انسانیت کی گھناؤنی پستی کو بھی واضح کیا ہے۔

امریکہ اور فرانس میں 1932 میں ایک جیبی ٹیلی ویژن کو آزمایا گیا جس میں دستی کیمرہ تھا اور آپریٹر کو ٹرانسمٹر اپنی پشت پر لگانا پڑتا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن اس کو مختلف کاموں میں استعمال کیا گیا ہے اور آزادانہ طور پر کسی بھی جگہ سے رپورٹنگ کے موقعے پر اسے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ ٹرانسمٹر کے مائکروویو سگنل سے علاقائی اسٹیشنوں کو فراہم کردیے جاتے ہیں جہاں سے یہ ٹیلی ویژن ناظرین کے لیے ترسیل کیے جاتے ہیں۔ کیمرے کی دیکھنے کی قوت کو یکسر کم اور زیادہ کرنے کی خاطر لوری عدسہ کی تخلیق عمل میں آئی۔ یہ عدسہ جو کہ ریاضی پر مبنی ہے سیکنڈوں میں کیمرے کی وسعت نظر کو گھٹا بڑھا سکتا ہے۔ یہ عدسہ خصوصی طور پر مکمل سڑکوں پر ہونے والے واقعات اور ایسے ہی دوسرے مناظر کو ٹیلی کاسٹ کرنے میں بہت مناسب ہے۔

رنگین ٹیلی ویژن کے مسائل کو بھی بہت پہلے حل کرلیا گیا تھا۔ ایک جرمن ماہر طبیعیات ٹو ودن بردنک نے سب سے پہلے 1902 میں رنگین تصویر ترسیل کرنے کے لیے پیٹنٹ لیا تھا۔ لیکن چوں کہ اس پر بہت زیادہ خرچ آتا تھا اس لیے اس کا استعمال ابتدا میں عام نہیں ہوسکا۔ امریکہ میں 1950 میں ٹیلی ویژن پر رنگین پروگرام گنے چنے افراد کے لیے جاری کیا گیا جو کہ اس کے خرچے کو برداشت کرسکتے تھے۔ برطانیہ میں رنگین ٹیلی ویژن کے آزمائشی پروگرام کی ابتدا 1955 میں ہوئی اور جاپان میں اس کا باضابطہ پروگرام 1960 میں شروع ہوا۔ رنگین ٹیلی ویژن کی قیمت گرچہ عام سفید و سیاہ ٹیلی ویژن کے مقابلے میں آٹھ گنا زیادہ ہے۔ لیکن ایک برس کے اندر ملک میں 15000 رنگین ٹیلی ویژن استعمال کیے جانے لگے۔ روس میں بھی رنگین ٹیلی ویژن پر پروگرام دکھائے جاتے ہیں۔

ٹیلی ویژن میں ایک اہم تکنیکی کامیابی (جس کا استعمال سنیما میں ممکن ہے) جو حاصل کی گئی وہ ہے ٹیلی ویژن کے پروگرام کو مقناطیسی ٹیپ پر ریکارڈ کرنا۔ دسمبر 1952 R.C.A. (آر.سی.اے.) میں تحقیق کرنے والے محققین نے ٹیلی ویژن کے پروگرام کو ٹیپ سے ریکارڈ کرنے کا مظاہرہ کیا۔ اس سے قبل پروگرام کا ریکارڈ رکھنے یا دوبارہ استعمال کرنے کے لیے "ٹیلی ریکارڈنگ" کا طریقہ تھا۔ یعنی پروگرام کے دوران اس کو فلم کرلیا جاتا تھا۔ یقیناً اس طرح سے ریکارڈ کیے گئے پروگرام میں وہ خوبی نہیں ہوتی تھی جو اوّل

الذکر رائج طریقے کے پروگرام میں ہوتی تھی۔ دوسرا طریقہ ہر پروگرام کو ٹیلی ویژن کے ساتھ ساتھ فلمانے کا تھا۔ ظاہر ہے کہ ٹیپ سے ریکارڈ کرنے کا طریقہ نہایت آسان سستا اور عام فہم ہے۔

اگرچہ الکٹریکل انجینئروں کے لیے آواز اور تصویر کے اصلس میں کوئی فرق نہیں لیکن تصویروں کو ریکارڈ کرنے کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ واضح اور بہتر آواز کو 16000 سائکل فی سیکنڈ کی رفتار سے ٹیپ پر ریکارڈ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اعلا درجے کی تصویر حاصل کرنے کے لیے تیس لاکھ سے پچاس لاکھ سائکل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے اصوات کے آلہ پذیری کو انتہا تک پہنچا دیا گیا اور ایک خاص قسم کے چوڑے ٹیپ کا استعمال کیا گیا تاکہ اس میں ہر طرح کے سگنل کو جذب کیا جاسکے۔

تصویروں کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر (video tape recorder) کی پہلی بیٹری امریکہ کے سب سے بڑے ٹیلی ویژن اسٹوڈیو میں 1958 میں لگائی گئی۔ اس نظام میں ٹیپ کا دو سو (200) انچ فی سیکنڈ کے حساب سے استعمال ہوتا ہے لیکن ٹیپ صرف آدھا انچ چوڑا ہوتا ہے۔ اس میں ریکارڈنگ تین ٹریک میں کی جاتی ہے۔ دو حصوں میں ویڈیو کے سگنل کو ریکارڈ کیا جاتا ہے اور تیسرے حصے پر آواز کو ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ ٹیپ کو کاٹنے اور جوڑ توڑ کرنے کے لیے ایک خاص قسم کی مشین ہوتی ہے۔

ویڈیو ریکارڈنگ کا طریقہ فلم بنانے کے طریقے سے بہتر ہے چوں کہ فلم کو دھوئے اور چھاپے بغیر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ویڈیو ٹیپ کو فوراً ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ساری فلم کی کہانی کو ٹیپ پر فلمایا جاسکتا ہے اور جوڑنے توڑنے کے بعد تصویروں اور آواز کو معمولی فلم پر منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح فلم بنانے کے خرچ میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں فلم پروجیکٹروں کے بجائے ویڈیو ٹیپ استعمال ہونے لگے۔

موجودہ دور میں ٹیلی ویژن صرف لوگوں کی تفریح ہی کے لیے نہیں بلکہ بچوں کو تعلیم دینے، طبی مظاہروں، فیکٹریوں کے نظام پر قدرت رکھنے (جیسے جوہری پاور اسٹیشنوں میں) انتہائی کارآمد ثابت ہوا ہے۔ بینکوں میں مرکزی حساب کے کاغذوں کے چربے کو اپنے دوسرے دفاتر تک پہنچانے کے لیے اس کا استعمال ہوتا ہے۔ ریل کے دفاتر ڈبوں کو رکھنے اور جوڑنے وغیرہ کی جگہ بھی ٹیلی ویژن استعمال کرتے ہیں۔ سمندر کے اندر قائم کیے ہوئے ٹیلی ویژن کے کیمرے آبی زندگی کی تفصیل اور غرق شدہ کشتیوں کی تصویریں بڑی خوبی سے کھینچتے ہیں۔ اس کے علاوہ خلا میں پرواز کرتے ہوئے طیارے ستاروں اور چاند کی تصویریں بڑی خوبی سے ٹیلی ویژن کے ذریعے زمین پر بھیجی جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس کی اس حیرت ناک ایجاد کے ذریعے بہت ساری نئی چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے اور ہماری زندگی زیادہ پُرمعنی ہو گئی ہے۔

□□□

نیو ہندستانی ــــ انگلش ڈکشنری

مرتب : ایس. ڈبلیو. فیلن

ایس. ڈبلیو. فیلن کی مرتب کردہ اس مشہور ڈکشنری میں اردو اور ہندی الفاظ کے معنی انگریزی میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ پہلی بار 1879 میں چھپی تھی۔ اس کی افادیت، اور اہمیت کے پیشِ نظر تب سے اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور آج بھی علمی حلقوں میں اس کی مانگ کم نہیں ہوئی ہے۔ صاحب فرہنگِ آصفیہ سید احمد دہلوی اس ڈکشنری کی ترتیب کے دوران فیلن کے معاونِ کار تھے۔ قومی اردو کونسل نے اس مشہور ڈکشنری کو خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔

صفحات: 1216، قیمت: -/418 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

ہماری مطبوعات — ''بھارت 2004'' سے اقتباس

قومی نشانات

قومی پرچم

قومی پرچم افقی طور پر تین رنگوں میں ہے۔ سب سے اوپر گہرا زعفرانی رنگ ہے، بیچ میں سفید اور گہرا سبز رنگ نیچے ہے۔ تینوں رنگوں کی پٹیاں متوازی اور حجم میں یکساں ہیں۔ اس کا تناسب 3:2 ہے۔ سفید پٹی کے وسط میں ایک نیوی بلیو چکر ہے جو چرخے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کا ڈیزائن اس چکر جیسا ہے جو اشوک کے سارناتھ کے شیر کے سرستون میں ہے۔ اس کا قطر سفید پٹی کی چوڑائی کے مطابق ہوتا ہے اور اس میں 24 تیلیاں ہوتی ہیں۔ قومی پرچم کے ڈیزائن کو 22 جولائی 1947 کو بھارت کی قانون ساز اسمبلی کے ذریعے اپنایا گیا تھا۔

حکومت کے ذریعے وقتاً فوقتاً جاری ہدایات (جو قانون کے تحت نہ دی گئی ہوں) کے (غیر مناسب استعمال کی روک تھام) ایکٹ 1950 (1950 کا شمار 12) اور توہین کی روک تھام کے سلسلے میں قومی وقار ایکٹ 1971 (1971 کا شمار 69) کا بندوبست نافذ ہوتا ہے۔ ہندوستانی ضابطۂ پرچم 2002، سبھی متعلقہ لوگوں کی رہنمائی اور مفاد کے لیے اس طرح کے سبھی قوانین، روایات، رسوم اور ہدایات کو یکجا کرنے کی ایک کوشش ہے۔

فلیگ کوڈ۔ انڈیا (ضابطۂ پرچم۔ ہندوستان) کی جگہ 26 جنوری 2002 سے ہندوستانی ضابطۂ پرچم 2002 (Flag code of India-2002) نے لے لی ہے۔ ہندوستانی ضابطۂ پرچم میں دیے گئے اہتمام کے مطابق عام شہریوں، نجی اداروں، تعلیمی اداروں کے ذریعے قومی پرچم کی نمائش کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن نشان اور ناموں (غیر مناسب استعمال کی روک تھام) ایکٹ 1950 اور قومی وقار کی توہین کی روک تھام ایکٹ 1971 اور اس ضمن میں دیگر متعلقہ قوانین میں دیے گئے اہتمام کی پابندی کرنی ہوگی۔

قومی نشان

قومی نشان اشوک کے سارناتھ لائن کیپٹل سے لیا گیا ہے۔ حقیقت میں چار شیر ایک دوسرے کی پیٹھ سے لگے ہوئے ایک چوکھٹے (باکس) پر کھڑے ہیں جس پر ایک ہاتھی، ایک چھلانگ لگاتا گھوڑا، ایک بیل اور ایک شیر بھی کھڑے ہوئے ہیں جو ایک گھنٹی کی شکل کے عکس پر بنے ہوئے چکر سے ایک دوسرے کو جدا کرتے ہیں۔ یہ پالش کیے ہوئے سنگ ریگ کے ایک ٹکڑے سے تراشا ہوا ہے۔ سرستون پر قانون کا پہیا (دھرم چکر) بنا ہوا ہے۔ مگر قومی نشان میں جس کو حکومت ہند نے 26 رجنوری 1950 کو منظور کیا تھا، تین ہی شیر دکھائے گئے ہیں۔ چوتھا شیر نظروں سے اوجھل ہے۔ چکر باکس کے بیچوں بیچ ہے جس کے دائیں جانب ایک بیل اور بائیں جانب ایک گھوڑا کھڑا ہوا ہے اور دوسرے چکروں کے بیرونی خطوط انتہائی دائیں اور بائیں جانب ہیں۔ گھنٹی کی شکل کے عکس کو نکال دیا گیا ہے۔ ''ستیہ میو جیتے'' کے الفاظ منڈکا اپنشد سے لے کر دیوناگری رسم خط میں اس باکس کے نیچے لکھے گئے ہیں جن کے معنی ہیں ''صرف سچ ہی کی فتح ہوتی ہے۔''

قومی ترانہ

آئین ساز اسمبلی نے 24 رجنوری 1950 کو بنگالی میں لکھے گئے رابندر ناتھ ٹیگور کے گیت جن گن من کو ہندی میں قومی ترانہ کے طور پر تسلیم کیا تھا۔ یہ گیت پہلی بار کانگریس کے کولکاتہ اجلاس میں 27 دسمبر 1911 کو گایا گیا تھا۔ مکمل گیت 5 بندوں پر مشتمل ہے اور پہلا (بند) پورا قومی ترانہ ہے۔

جن گن من ادھینا ئک جے ہے
بھارت بھاگیہ ودھاتا
پنجاب سندھ گجرات مراٹھا
دراوڑ، اتکل، بنگا
وندھیا، ہماچل، جمنا، گنگا
اچھل۔ جلدھی۔ ترنگا
تو شبھ نامے جاگے
تو شبھ آشیش مانگے
گاہے تو جے گاتھا
جن گن منگل دائک جے ہے
بھارت بھاگیہ ودھاتا
جے ہے جے ہے جے ہے
جے ہے جے ہے جے ہے

● یہ کتاب اردو زبان میں بھارت کے بارے میں معتبر اور مفید معلومات کا خزانہ ہے۔ بھارت کی تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، اقتصادی، تجارتی، صنعتی اور لسانی منظرنامے سے مستند واقفیت حاصل کرنے کے لیے قارئین کے پاس اس کتاب کی موجودگی ضروری ہے۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے والے طلبہ کے لیے یہ کتاب خصوصی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔ 949 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/250 روپے ہے۔ کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد رعایت دیتی ہے۔

پورے قومی ترانے کو گانے میں لگ بھگ 52 سیکنڈ لگتے ہیں۔ بند کی پہلی اور آخری سطروں پر مشتمل مختصر قومی ترانہ بھی چند مواقع پر گایا جاتا ہے۔ (گانے کا وقت تقریباً 20 سیکنڈ) ٹیگور کے قومی ترانے کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

تو تمام لوگوں کے ذہنوں میں حکمرانی کرتا ہے
بھارت کے مستقبل کا لہرانے والا ہے
تیرا نام پنجاب، سندھ، گجرات
اور مراٹھا کے دلوں میں امنگ بھر دیتا ہے
دراوڑ، اڑیسہ اور بنگال کے دلوں میں بھی
یہ وندھیا اور ہمالیہ کے کوہستانی سلسلوں میں گونجتا ہے
جمنا اور گنگا کی موسیقی میں گھل مل جاتا ہے
اور بھارتی سمندروں کی لہروں کے ذریعے گایا جاتا ہے
وہ تیری عنایت اور آشیرواد کی التجا کرتے ہیں اور تیری تعریف بیان کرتے ہیں۔
تمام لوگوں کی نجات تیرے ہاتھ میں ہے
تو بھارت کی قسمت کا مالک ہے
تیری فتح ہو، فتح ہو، فتح ہو

قومی گیت

سنسکرت میں لکھا گیا بنکم چندر چٹرجی کا گیت ''وندے ماترم'' جدوجہد آزادی میں لوگوں کو تحریک دینے کا ذریعہ تھا۔ اس کا جن گن من کے برابر ہی مرتبہ ہے۔ پہلی بار سیاسی سطح پر 1896 میں اسے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں گایا گیا تھا۔ اس کے پہلے بند کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

وندے ماترم!
سجلام، سپھلام، ملیج شیتلام،
شسیہ شیاملام، ماترم!
شبھر جیوتسنا، پلکت یامنیم،
پھلا کسمت درمدل شوبھنیم،
سہاسنیم سم دھر بھاشنیم،
سکھدام، وردام، ماترم!

قومی کیلنڈر

قومی کیلنڈر ''شک سمبت'' پر مبنی ہے اور ''چیت'' مہینے سے شروع ہوتا ہے جس کا سال 365 دن کا ہوتا ہے۔ اس کو 22 مارچ 1957 کو گریگورین کیلنڈر کے ساتھ مندرجۂ ذیل سرکاری مقاصد کے لیے نافذ کیا گیا تھا۔

(i) گزٹ آف انڈیا (ii) آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے خبروں کی نشریات (iii) حکومت ہند کے ذریعے جاری کیے جانے والے کیلنڈر اور (iv) عام لوگوں کو بھیجے جانے والے سرکاری مراسلات۔

قومی کیلنڈر کی تاریخیں مستقل طور پر گریگورین کیلنڈر کی تاریخوں کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔ ''چیت'' کی پہلی تاریخ عام طور پر 22 مارچ کو آتی ہے اور لیپ سال میں 21 مارچ کو آتی ہے۔

قومی جانور

شان و شوکت والا چیتا (باگھ) (Pant Hera Tigris) دھاریوں والا ایک پٹی دار جانور ہے۔ کالی دھاریوں کے ساتھ اس کے گنجان زرد بال ہوتے ہیں۔ شان و شوکت اور طاقت کے پیکر چیتا (باگھ) کو بھارت کا قومی جانور بنایا گیا ہے۔ اس کی آٹھ نسلوں میں سے ہندوستانی نسل یعنی رائل بنگال ٹائیگر شمال مغربی علاقہ اور نواحی ملکوں نیپال، بھوٹان اور بنگلہ دیش سمیت پورے بھارت میں پایا جاتا ہے۔ بھارت میں ٹائیگر کی آبادی کو گھٹنے سے روکنے کے لیے اپریل 1973 میں پروجیکٹ ٹائیگر شروع کیا گیا تھا۔ اب تک اس پروجیکٹ کے تحت ملک بھر میں 27 ٹائیگر ریزروس قائم کیے جاچکے ہیں جن کا مجموعی رقبہ 37.761 مربع کلومیٹر ہے۔

قومی پرندہ

مور ہندوستان کا قومی پرندہ ہے۔ یہ ہنس کی جسامت کا رنگ برنگا پرندہ ہے جس کے پر پنکھوں کی شکل کے ہوتے ہیں۔ اس کی آنکھ کے نیچے ایک سفید دھبہ ہوتا ہے اور اس کی گردن لمبی ہوتی ہے۔ مور مورنی سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے جس کا سینہ اور گردن چمکدار اور نیلے رنگ کے ہوتے ہیں اور لگ بھگ 200 پروں کے کانسہ و ہرے رنگ کے خوبصورت پنکھ ہوتے ہیں۔ مورنی بھوری رنگت لیے ہوتی ہے اور مور سے کچھ چھوٹی ہوتی ہے اس کے بڑے پنکھ نہیں ہوتے۔ مورنی کو رجھانے کے لیے جب رقص کرتا ہے تو اپنی دم کو پھیلا دیتا ہے اور پروں کو کھول دیتا ہے۔ یہ ایک بہت خوبصورت منظر ہوتا ہے۔

برصغیر ہند میں مور دور دور تک پایا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کے جنوب اور مشرق سے لے کر جموں و کشمیر، مشرقی آسام، جنوبی میزورم اور پورے ہندوستانی جزیرہ نما میں مور ملتے ہیں۔ لوگ موروں کو تحفظ دیتے ہیں کیونکہ اسے مذہبی یا جذباتی وجوہ سے کبھی نقصان نہیں پہنچایا جاتا ہے۔ انڈین وائلڈ لائف (پروٹکشن) ایکٹ 1972 کے تحت اس کو پورا تحفظ حاصل ہے۔

قومی پھول

بھارت کا قومی پھول کمل ہے۔ یہ ایک پاکیزہ پھول ہے اور قدیم بھارتیہ کلا اور پرانوں میں اس کا ایک اہم مقام ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی اسے ہندوستانی تہذیب کا مبارک نشان مانا جاتا رہا ہے۔

□□□

امیت جین، سمراٹ شرما، سوربھ بنرجی

"مائکروسافٹ پاور پوائنٹ" سے اقتباس

شیپس کے ساتھ لطف اندوزی

کیا آپ نے بچپن میں کہانی کی کتابیں پڑھی ہیں؟ ہمیں یقین ہے کہ آپ نے ضرور پڑھی ہوں گی۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اگر وہ سفید اور سیاہ یعنی بلیک اینڈ وائٹ ہوتیں تو کیسی لگتیں؟ وہ آپ کی توجہ مبذول کرانے کے قابل نہ ہوتیں۔ یہی بات آپ کے پریزنٹیشن میں بھی ہے۔ ٹمپلیٹوں اور ڈیزائن لے آؤٹ کو استعمال کر کے آپ اپنے پریزنٹیشن کے اندر کچھ رنگ بھرتے ہیں۔ لیکن آیئے اب دیکھیں کہ رنگ برنگے شیپس کیسے بنائے جا سکتے ہیں۔

ڈرائنگ ٹولس اور آٹو شیپس کا استعمال:

ڈاکومنٹ میں گرافکس کا اضافہ کرنے سے اسے ایک شیپ مل جاتا ہے۔ لیکن امیجز اور کلپس ہمیشہ ڈاکومنٹ کو زیب نہیں دیتے۔ لکیریں، ایروز اور دوسرے شیپس ٹول کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں، تاکہ کسی پوائنٹ کو نمایاں کیا جا سکے۔

لکیروں اور ایروز کی بناوٹ

لائنوں، لکیروں اور ایروز سے آپ کے پریزنٹیشن کے اندر گرافکس کی نوعیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ انھیں کسی چیز کو لیبل کرانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ایروز تو بس ایک سرے والی لکیریں ہوتی ہیں۔ لائنوں اور ایروز کا ایک نقطۂ آغاز اور ایک نقطۂ انجام ہوتا ہے اور ان دونوں کے اندر ایک ری سائز ہینڈل بھی ہوتا ہے۔

کوئی لائن یا لکیر ڈرا کرنے کے حسب ذیل طریقے ہیں:

(1) لائن ٹول آئی کن [[redacted]] پر کلک کیجیے۔

(2) جس جگہ آپ لائن انسرٹ کرانا چاہتے ہیں ماؤس پوائنٹر کو اس جگہ رکھیے۔

(3) کلک کیجیے اور لائن کے آخر تک ماؤس کو کھینچتے ہوئے لے جایئے۔

ایرو ڈرا کرنے کا بھی ٹھیک یہی طریقہ ہے۔ مگر آپ کو ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا۔ وہ یہ کہ جس جگہ لائن ختم ہو اسی جگہ ایرو کا سرا ہونا چاہیے۔ یقیناً اس کے لیے آپ کو ایرو ٹول آئی کن پر [[redacted]] کلک کرنا ہوگا۔

ریکٹینگل اور الپس کی ڈرائنگ

اپنے ڈاکومنٹ کو زیادہ خوشنما اور رنگین بنانے کے لیے ہم اس میں کچھ ریکٹینگلس اور سرکلس بنا سکتے ہیں۔ اسے آپ کیوں نہیں آزماتے۔

پریزنٹیشن میں درج ذیل طریقے سے ریکٹینگل بنایا جا سکتا ہے۔

(1) ڈرائنگ ٹول بار کے ریکٹینگل ٹول آئی کن [[redacted]] پر کلک کیجیے۔

(2) ماؤس پوائنٹر کو اس جگہ لے جایئے جہاں آپ ریکٹینگل بنانا چاہتے ہیں۔

(3) ماؤس کو کلک کیجیے اور اسے ڈائگنلی ڈریگ کیجیے یہاں تک کہ آپ کا ریکٹینگل اس سائز کا بن جائے جیسا آپ چاہتے ہیں۔

پریزنٹیشن میں الپس/سرکل (ellipes/circle) ڈرا کرنے کے طریقے:

(1) ڈرائنگ ٹول بار کے الپس ٹول آئی کن [[redacted]] پر کلک کیجیے۔

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز سی۔ایس۔آئی۔آر یونٹ نے طلبہ اور عام شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے "سب کے لیے آئی ٹی سیریز" کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین "اردو دنیا" کے لیے اس سیریز کی کتاب "مائکروسافٹ پاور پوائنٹ" سے اقتباس پیش ہے۔

(2) ماؤس پوائنٹر کو ایسی جگہ رکھیے جہاں آپ الپس کو رکھنا چاہتے ہیں۔

(3) ماؤس کو کلک کر کے اسے کھینچتے رہیے یہاں تک کہ آپ کے حسب خواہش شکل بن جائے۔

آٹو شیپ فیچر کا استعمال

کبھی کبھی کچھ شیپس ڈرائنگ کرتے وقت اچانک ریکٹنگل یا سرکل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آٹو شیپ فیچر اس شیپ کو بنانے میں آپ کی مدد کرتا ہے، جو آپ اپنے ڈاکومنٹ میں بنانا چاہتے ہیں۔ آٹو شیپ ٹول ایک ذیلی مینو ظاہر کرتا ہے جس میں کچھ اس طرح کے آبجیکٹ ہوتے ہیں مثلاً بلاک ایروز (Block arrows)، فلو چارٹ باکس، تارے اور بینرز (banners) وغیرہ۔

آیئے ہم اپنے پریزنٹیشن میں ایک آٹو شیپ بنائیں۔

(1) ڈرائنگ ٹول بار کے آٹو شیپ بٹن پر کلک کیجیے۔

(2) سامنے نمودار ہونے والے مینو سے جو آٹو شیپ چاہیں اس پر کلک کریں۔

(3) پوائنٹر کو اس جگہ کلک کریں جہاں آٹو شیپ کو لانا چاہتے ہیں اور اسے کھینچتے رہیں یہاں کہ وہ شیپ اور سائز بن جائے جو چاہتے ہیں۔

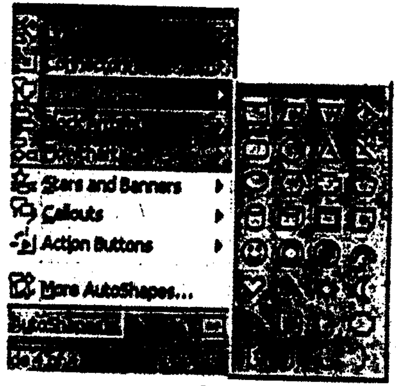

آٹو شیپ مینو

تھری ڈی میں کام کرنا

اگر آپ آبجیکٹ میں تھری ڈی گرافکس کا اضافہ کرتے ہیں تو معلوم ہے کیا ہوگا؟ کیا یہ اچھا نہیں لگے گا؟ پھر آپ ایسا کیوں نہیں کرتے؟

آیئے ہم اپنے پریزنٹیشن میں دیے ہوئے شیپس کے اندر تھری ڈی گرافکس کا اضافہ کریں۔

(1) اس شیپ کو سلیکٹ کیجیے جسے آپ تھری ڈی کے اندر لانا چاہتے ہیں۔

(2) ڈرائنگ ٹول بار کے تھری ڈی بٹن پر کلک کیجیے۔

(3) تھری ڈی ویژن اور ویلا (Voila) کو سلیکٹ کیجیے۔ ایک تھری ڈی آبجیکٹ تیار ہو گیا۔

اب یہ ایک اچھا اثر ہے لیکن اسے احتیاط سے استعمال کیجیے ورنہ ایک اچھے خاصے ڈاکومنٹ کو خراب کر دیں گے۔

اپنے صفحہ کے کلر میں اضافہ کرنا

آپ بھی رنگوں کے استعمال سے تو واقف ہی ہوں گے۔ آپ کے پاس ٹی وی یا کلر مانیٹر تو ہوگا ہی پھر آپ کے پریزنٹیشن کا ٹیکسٹ کیوں بلیک اینڈ وائٹ رہے؟ ویرنہ کیجیے۔ آیئے اپنی دنیا کو رنگین بنایئے۔

ورڈ آرٹ کو انسرٹ کرنا

آپ اپنے ٹیکسٹ میں زیادہ سے زیادہ رنگوں کا استعمال کر سکتے ہیں اور اپنے سلائڈ کے اندر ورڈ آرٹ کا استعمال کر کے اسے اور زیادہ جاذب نظر بنا سکتے ہیں۔

سلائڈ میں ورڈ آرٹ انسرٹ کرنے کا آسان طریقہ:

(1) ڈرائنگ ٹول بار کے ورڈ آرٹ بٹن پر کلک کیجیے۔

(2) جو اسٹائل آپ چاہتے ہیں اسے سلیکٹ کیجیے اور OK بٹن پر کلک کیجیے۔

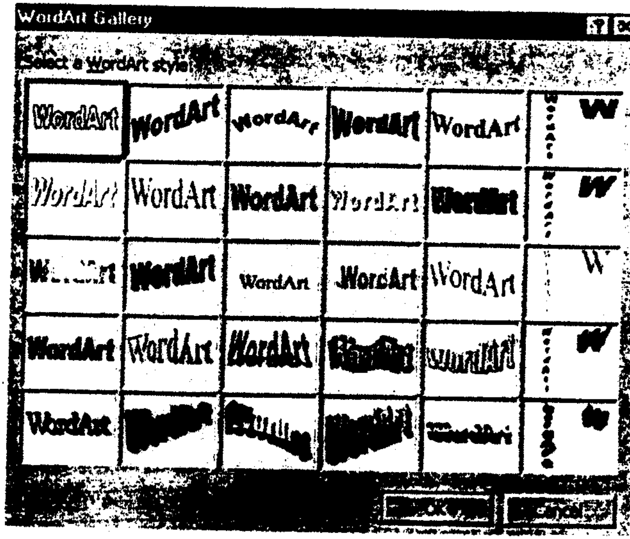

(3) دوسرے ڈائیلاگ باکس میں اپنے ٹیکسٹ کو ٹائپ کیجیے، فونٹ اور فونٹ سائز کو سلیکٹ کیجیے اور OK پر کلک کیجیے۔

آپ کے ورڈ آرٹ کا کام ہو گیا۔ آپ چاہیں تو دوبارہ اس کا سائز گھٹا یا بڑھا سکتے ہیں۔ اس کے لیے بس اس کے کناروں کو اپنے من پسند سمت کی طرف کھینچتے رہیے۔ سرخیوں کے لیے یہ بہت ہی عمدہ افیکٹ ہے۔

فل کلر کا استعمال

(1) آٹو شیپ (یعنی وہ مستطیل جو آپ نے بنایا ہے) کو سلیکٹ کیجیے۔

(2) ڈرائنگ ٹول بار کے فل کلر اکسٹینشن بٹن کے ذریعے صحیح کلر کا انتخاب کیجیے۔

(3) فل کلر بٹن پر کلک کیجیے۔

لائنوں، لکیروں اور ایروز (تیر کے نشان) کو کلر کرنے کے لیے بس لائن کلر بٹن کے ذریعے مذکورہ بالا عمل کو دہرائیں۔ کلر میں اضافہ کرنے کے لیے اس ایرو کا استعمال کریں جو آپ نے بنایا ہے۔

ٹیکسٹ کو کلر کرنا

(1) جس ٹیکسٹ کو کلر کرنا چاہتے ہیں اسے سلیکٹ کیجیے۔

(2) ڈرائنگ ٹول بار کے فونٹ کلر آپشن پر کلک کیجیے۔

(3) اس کے اضافی بٹن پر کلک کر کے جو کلر آپ چاہیں اسے سلیکٹ کیجیے۔ لال رنگ بہتر دکھائی دیتا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

اب آپ کا ٹیکسٹ رنگین ہو گیا۔ ہمیں اچھا محسوس ہوگا کہ آپ اپنے سلائڈس کو کلر کریں۔ بجائے اس کے کہ اپنے پرانے بلیک اینڈ وائٹ کلر کو دہرائیں۔

□□□

مرزا محمد رفیع سودا

مصنف: خلیق انجم

سودا کی شاعرانہ عظمت سے کسی کو اختلاف نہیں۔ غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن میں بھی انھوں نے جو طبع آزمائی کی ہے وہ ان کی قادر الکلامی اور ہمہ گیری کا بین ثبوت ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر خلیق انجم نے سودا کے سوانحی حالات، ان کے عہد کے سماجی کوائف اور ان کوائف سے ان کے دل و دماغ پر مرتب ہونے والے اثرات کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور ان کے شاعرانہ کمالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب سودا ہی کو نہیں، ان کے عہد کو سمجھنے میں بھی مدد کرتی ہے۔

صفحات: 673، قیمت: -/173 روپے

کلیات ذوق (اردو)

مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی

شیخ محمد ابراہیم ذوق کا تمام و کمال اردو کلام اس کلیات میں شامل ہے۔ ذوق کا دیوان اُن کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا تھا، ان کے انتقال کے بعد ان کے بعض شاگردوں نے جن میں ظہیر دہلوی، حافظ ویران اور مولانا محمد حسین آزاد شامل ہیں، ان کا منتشر کلام یکجا کر کے اپنے اپنے طور پر شائع کیا۔ یہ کلیات تنویر احمد علوی نے ان تمام نسخوں کو، جو اب تک شائع ہوئے ہیں، سامنے رکھ کر تحقیقی نہج پر مرتب کیا ہے۔

صفحات: 496، قیمت: -/93 روپے

دیوان درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

یہ خواجہ میر درد کے اردو دیوان کا تحقیقی ایڈیشن ہے جو ڈاکٹر نسیم احمد نے بڑی دیدہ ریزی سے دیوانِ درد کے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے۔ حواشی میں مختلف نسخوں میں پائے جانے والے اختلافات کی نشاندہی کر دی گئی ہے اور جس متن کو ترجیح دی گئی ہے، اس کی وجہ بھی دی گئی ہے۔ کتاب میں درد کے سوانحی کوائف اور ان کی دیگر تصنیفات کا تعارف بھی دیا گیا ہے، جن میں بعض نثری رسالوں کے علاوہ درد کا فارسی دیوان شامل ہے۔

صفحات: 336، قیمت: 160 روپے

کلیات اکبر الٰہ آبادی (جلد اوّل)

مرتب: احمد محفوظ

اکبر الٰہ آبادی اپنے عہد کے مقبول ترین شعرا میں تھے۔ طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ ان کے کلام بالخصوص غزل میں خیال بندی کا جو انداز ملتا ہے وہ ان کے ہمعصر دوسرے شعرا کے یہاں کمیاب ہے۔ قومی اردو کونسل نے ان کی کلیات چار جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ جلد اوّل غزلوں پر مشتمل ہے اور اردو کے علاوہ ہندی حلقوں میں بھی اکبر کے کلام سے دلچسپی کے پیشِ نظر اسے اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں چھاپا گیا ہے۔

صفحات: 693، قیمت: -/370 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

ابوفہیم خاں کوئز

اردو ادب

کوئز کے صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اس مہینے کی 15 تاریخ تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) کس شاعر کی فطرت بنیادی طور پر انقلابی ہے اور بغاوت سے اس کا خمیر اٹھا ہے؟

(الف) اسرارالحق مجاز (ب) جگر مرادآبادی
(ج) شاد عظیم آبادی (د) اختر انصاری

(2) ناول "آگ کا دریا" میں کس تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے؟

(الف) شعور کی رو (ب) بیانیہ انداز
(ج) ڈرامائی انداز (د) خطوط کی تکنیک

(3) "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لاالٰہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر" — کس کا قول ہے؟

(الف) ابوالکلام آزاد (ب) سرسید احمد خاں
(ج) محمد علی جوہر (د) شبلی نعمانی

(4) "فسانۂ آزاد" کے بارے میں کون سی بات درست ہے؟

(الف) اس میں لکھنؤ کی تہذیب کی عکاسی ہے
(ب) یہ مربوط پلاٹ کا ناول ہے
(ج) یہ افسانوی مجموعہ ہے
(د) یہ محمد حسین آزاد کی سوانح عمری ہے

(5) "زنداں نامہ" کیا ہے؟

(الف) شعری مجموعہ (ب) افسانوی مجموعہ
(ج) ناول (د) خاکوں کا مجموعہ

(6) مرزا ظاہر دار بیگ کا کردار کس ناول میں ملتا ہے؟

(الف) امراؤ جان ادا (ب) فسانۂ عجائب
(ج) فسانۂ آزاد (د) توبۃ النصوح

(7) مقفّٰی و مسجّع عبارت کے نمونے کس کتاب میں ملتے ہیں؟

(الف) فسانۂ عجائب (ب) باغ و بہار
(ج) غبار خاطر (د) نیرنگ خیال

(8) مندرجۂ ذیل میں سے پنڈت برج نرائن چکبست کا شعری مجموعہ کون سا ہے؟

(الف) صبح وطن (ب) خاک وطن
(ج) انجم کدہ (د) غبار افق

(9) اردو کے کس ناول نگار نے اصلاح معاشرہ اور تعلیم نسواں کی بنیاد پر اپنے ناول لکھے ہیں؟

(الف) ڈپٹی نذیر احمد (ب) عصمت چغتائی
(ج) پریم چند (د) کرشن چندر

(10) آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے
اس میں شاعر نے کس صنعت کا استعمال کیا ہے؟

(الف) ایہام (ب) تشبیہ
(ج) حسن تعلیل (د) تجنیس

(11) عملی تنقید کے اچھے نمونے کس نقاد نے پیش کیے ہیں؟

(الف) آل احمد سرور (ب) احتشام حسین
(ج) خواجہ الطاف حسین حالی (د) محمد حسین آزاد

(12) ہندوستانی فضا کی عکاسی میں نظیر اکبرآبادی کا ہمسر کون ہے؟

(الف) قلی قطب شاہ (ب) پنڈت برج نرائن چکبست
(ج) جوش ملیح آبادی (د) اکبر الٰہ آبادی

(13) اردو کا پہلا اخبار کس نے نکالا؟

(الف) مولوی محمد باقر (ب) حیات اللہ انصاری
(ج) ظفر علی خاں (د) ابوالکلام آزاد

(14) "ذوقِ ادب اور شعور" کا مصنف کون ہے؟

(الف) احتشام حسین (ب) آل احمد سرور
(ج) مجنوں گورکھپوری (د) کلیم الدین احمد

(15) خمریات کا شاعر کس کو کہا جاتا ہے؟

(الف) اصغر گونڈوی (ب) ریاض خیرآبادی
(ج) فراق گورکھپوری (د) جگر مرادآبادی

(16) "مسدس حالی" کس کی فرمائش پر لکھی گئی تھی؟

(الف) شبلی نعمانی (ب) ڈپٹی نذیر احمد
(ج) سرسید احمد خاں (د) محمد حسین آزاد

(17) اردو کے رومانوی ادب میں کس کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے؟

(الف) خواجہ الطاف حسین حالی (ب) مجنوں گورکھپوری

(ج) محمد حسین آزاد (د) مہدی افادی

(18) مصورِ غم کس کو کہا جاتا ہے؟

(الف) راشد الخیری (ب) عبدالحلیم شرر

(ج) پنڈت رتن ناتھ سرشار (د) نذیر احمد

(19) مخدوم محی الدین کس کتاب کے مصنف ہیں؟

(الف) سرخ سویرا (ب) سیف و سبو

(ج) دست صبا (د) تلخیاں

(20) خدائے سخن کس شاعر کو کہا جاتا ہے؟

(الف) ولی دکنی (ب) میر تقی میر

(ج) مرزا محمد رفیع سودا (د) مرزا غالب

(21) سب رس کا سنہ تصنیف ہے—

(الف) 990ھ (ب) 1111ھ

(ج) 1018ھ (د) 1045ھ

(22) "غزل اردو شاعری کی آبرو ہے" کس کا قول ہے؟

(الف) مسعود حسین رضوی (ب) الطاف حسین حالی

(ج) رشید احمد صدیقی (د) آل احمد سرور

(23) فانی بدایونی کا نام کیا ہے؟

(الف) شوکت علی خاں (ب) جعفر علی خاں

(ج) ظفر علی خاں (د) فضل الحق

(24) رانی کیتکی کی کہانی کا اہم وصف کیا ہے؟

(الف) فارسی عناصر سے عاری ہونا

(ب) فارسی عناصر سے مملو ہونا

(ج) فارسی محاورات کی کثرت

(د) فارسی داستانوں کا ہو بہو چربہ ہونا

(25) عبدالحلیم شرر کی کون سی تصنیف تہذیبی تاریخ کا درجہ رکھتی ہے؟

(الف) فردوس بریں (ب) گذشتہ لکھنؤ

(ج) ایام عرب (د) فتح اندلس

(26) پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
یہ شعر کس شاعر کا ہے؟

(الف) میر تقی میر (ب) مرزا غالب

(ج) خواجہ میر درد (د) شیخ محمد ابراہیم ذوق

(27) "آوارہ" کس کی نظم ہے؟

(الف) جوش ملیح آبادی (ب) اسرار الحق مجاز

(ج) فیض احمد فیض (د) مخدوم محی الدین

(28) "غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے" کس کا قول ہے؟

(الف) کلیم الدین احمد (ب) اعجاز حسین

(ج) احتشام حسین (د) آل احمد سرور

(29) شاہین کا استعارہ سب سے زیادہ کس شاعر نے استعمال کیا ہے؟

(الف) محمد اقبال (ب) فیض احمد فیض

(ج) جمیل مظہری (د) مرزا غالب

(30) کسی مشہور واقعہ یا قصے کی طرف کس صنعت میں اشارہ کیا جاتا ہے؟

(الف) تلمیح (ب) استعارہ

(ج) تشبیہ (د) کنایہ

(31) اردو کس خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے؟

(الف) دراوڑی (ب) آریائی

(ج) ہند آریائی (د) سامی

(32) فورٹ ولیم کالج کا قیام کب عمل میں آیا؟

(الف) 1800 (ب) 1802

(ج) 1801 (د) 1806

(33) "یادگار غالب" کے مصنف کون ہیں؟

(الف) خواجہ الطاف حسین حالی (ب) پنڈت رتن ناتھ سرشار

(ج) سرسید احمد خاں (د) شبلی نعمانی

(34) "باغ و بہار" کب شائع ہوئی؟

(الف) 1801 (ب) 1802

(ج) 1803 (د) 1806

(35) جوش ملیح آبادی کا پورا نام کیا تھا؟

(الف) شبیر حسن خاں (ب) شوکت حسن خاں

(ج) فضل الحسن (د) شبیر احمد خاں

(36) "ہوری" کا کردار کس مصنف نے پیش کیا ہے؟

(الف) پریم چند (ب) کرشن چندر

(ج) سہیل عظیم آبادی (د) راجندر سنگھ بیدی

(37) "سراپا" کا استعمال کس صنف میں ہوتا ہے؟

(الف) مرثیہ (ب) مثنوی

(ج) قصیدہ (د) واسوخت

(38) "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک 'وید مقدس' دوسری 'دیوان غالب'"— یہ کس کا قول ہے؟

(الف) آل احمد سرور (ب) اعجاز حسین

(ج) مجنوں گورکھپوری (د) عبدالرحمٰن بجنوری

(39) "پھول بن" کس شاعر کی مثنوی ہے؟

(الف) ملا وجہی (ب) ابن نشاطی

(ج) غواصی (د) فائز

(40) ''آتش گل'' کس کا شعری مجموعہ ہے؟
(الف) جگر مرادآبادی (ب) فانی بدایونی
(ج) ساحر لدھیانوی (د) اصغر گونڈوی

(41) آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے
مندرجۂ بالا شعر میں کس صنعت کا استعمال کیا گیا ہے؟
(الف) استعارہ (ب) تلمیح
(ج) تجاہلِ عارفانہ (د) کنایہ

(42) ''فنِ ہائے گفتنی'' اور ''فنِ داستان گوئی'' کس مشہور نقاد کی تصانیف ہیں؟
(الف) احتشام حسین (ب) کلیم الدین احمد
(ج) آل احمد سرور (د) ڈاکٹر محمد حسن

(43) ''چمپا'' قرۃ العین حیدر کے کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) کارِ جہاں دراز ہے (ب) گردشِ رنگِ چمن
(ج) آگ کا دریا (د) آخرِ شب کے ہمسفر

(44) ''نقشِ فریادی'' کس شاعر کا مجموعۂ کلام ہے؟
(الف) علی سردار جعفری (ب) کیفی اعظمی
(ج) فیض احمد فیض (د) جوش ملیح آبادی

(45) مرزا اسد اللہ خاں غالب کی جائے پیدائش ہے—
(الف) دہلی (ب) آگرہ
(ج) لکھنؤ (د) حیدرآباد

(46) ''کاشف الحقائق'' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) امداد امام اثر (ب) جمیل جالبی
(ج) خواجہ غلام السیدین (د) ڈاکٹر محمد حسن

(47) امانت کی ''اندرسبھا'' کب تصنیف ہوئی؟
(الف) 1810 (ب) 1825
(ج) 1840 (د) 1853

(48) ''یادوں کی برات'' کس مشہور شاعر کی خود نوشت سوانح حیات ہے؟
(الف) فیض احمد فیض (ب) جوش ملیح آبادی
(ج) علی سردار جعفری (د) اختر الایمان

(49) ''پنجاب میں اردو'' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) مسعود حسین خاں (ب) شوکت سبزواری
(ج) حافظ محمود شیرانی (د) عبدالقادر سروری

(50) ''باغ و بہار'' سے قبل قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ''نوطرزِ مرصع'' کے نام سے کس نے کیا؟
(الف) نہال چند لاہوری (ب) عطا حسین تحسین
(ج) مرزا مظہر جانِ جاناں (د) میر امن

ہمیں جون کے کوئز انعامی مقابلے کے متعدد صحیح جوابات موصول ہوئے۔

جانچ کے بعد قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل حضرات کو بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. سنجر ہلال بھارتی
معرفت (اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ کلکتہ مدرسہ)
21، حاجی محمد محسن اسکوائر، کولکاتا-700016

2. رابعہ بیگم
معرفت ''جہانِ اردو''
رحم گنج، دربھنگہ-846004 (بہار)

3. عبدالخالق سیوانی
سرسید ہال، (نارتھ)، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی،
علیگڑھ-202002 (یوپی)

انعام یافتگان کو ادارے کی طرف سے مبارکباد۔
آپ کے انعامات جلد ہی بذریعۂ ڈاک ارسال کردیے جائیں گے۔
(ادارہ)

پچھلے انعامی مقابلے (کوئز) کے صحیح جوابات یہ ہیں:

1. الف 2. ج 3. ب 4. د 5. د
6. ب 7. الف 8. ب 9. ج 10. د
11. د 12. د 13. ج 14. ب 15. ج
16. ب 17. د 18. ب 19. ج 20. ج
21. الف 22. د 23. د 24. ب 25. ب
26. ج 27. الف 28. ج 29. الف 30. ج
31. د 32. ب 33. ج 34. د 35. ج
36. الف 37. ج 38. ج 39. د 40. ج
41. ب 42. ب 43. د 44. ب 45. ج
46. ج 47. د 48. ب 49. الف 50. ب
51. ج 52. ب

محمد انعام الحق

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو۔24

بڑھتے قدم

محمد ریحان کا تعلق شاہجہاں پور (اترپردیش) سے ہے۔ محمد ریحان نے شاہجہاں پور سے بی گریجویشن کیا اور قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جارہے کمپیوٹر سینٹر سے ڈپلوما اِن کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ کورس کیا اور اس کورس کی بدولت آج برسرِروزگار ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: میرے والد الیکٹرانک الیکٹریشین ہیں جنھوں نے مجھے کمپیوٹر کی طرف راغب کیا اور ہمارے شہر میں جب کمپیوٹر سینٹر قائم ہوا تو اس کی اہمیت کے پیشِ نظر میرے دل میں کورس کرنے کا شوق پیدا ہوا۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر میں ہمیں ہفتے کے چھ دن اور روزانہ چار گھنٹے پڑھایا جاتا تھا۔ یہاں پر اساتذہ نہایت محنت اور محبت سے پڑھاتے ہیں جبکہ دوسرے سینٹروں کا مقصد صرف اپنے کاروبار کو بڑھانا ہوتا ہے۔ وہ بہت زیادہ فیس وصول کرتے ہیں اور اتنی اچھی رہنمائی بھی نہیں کرتے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: دوسرے سینٹروں کے بارے میں تو میں زیادہ نہیں جانتا لیکن شاہجہاں پور کمپیوٹر سینٹر میں جو تربیت کا طریقہ ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ ہر سطح کے طلبہ یہاں کی تربیت سے مطمئن ہیں۔ طالب علموں کو کبھی بھی کسی قسم کی دقت یا پریشانی نہیں ہوتی۔ یہاں کے اساتذہ طلبہ کی پوری رہنمائی کرتے ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اُردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔ کونسل کا کمپیوٹر ڈپلوما چونکہ منظور شدہ ہے اور DOEACC بھی اس کی سند دیتی ہے اس لیے یہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے روزگار و ملازمت حاصل کرنے کے کافی مواقع ہیں جس کی زندہ مثال میں خود ہوں کہ کورس کرتے ہی مجھے کچہری میں نوکری مل گئی۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: مجھے فخر ہے کہ اب میں ان لوگوں کی صف میں شامل ہوں جو آج کی دنیا کے سب سے بہتر لوگ ہیں اور نئے دور کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: اب میں پوری طرح سے مطمئن ہوں، مجھے اب کسی طرح کی احساسِ کمتری نہیں ہے۔ میری خود اعتمادی اور خود انحصاری میں بھی اضافہ ہوا ہے جس کے لیے میں کونسل کا ممنون ہوں۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: ملٹی لنگول ہونے کی بنا پر آج میں اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے بہتر مقام پر پاتا ہوں کیونکہ ایک سے زائد زبانیں جاننے والوں کے لیے مارکیٹ میں کافی مواقع ہیں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، اس کی ادائیگی آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: کورس میں دی جانے والی سہولیات کے مدِنظر کمپیوٹر سینٹر کی فیس اتنی کم ہے کہ میرے خیال میں کسی بھی شخص کے لیے بوجھ نہیں ہوگی۔

□□□

اردو خبرنامہ

مذاکرہ ''سائنسی تعلیم اور ہندوستانی مسلمان''

● نئی دہلی، 10 مئی۔ مسلم ایسوسی ایشن فار ایڈوانسمنٹ آف سائنس (علی گڑھ) کی جانب سے ''سائنسی تعلیم اور ہندوستانی مسلمان'' کے موضوع پر 9 اور 10 مئی کو منعقدہ قومی سیمینار کی افتتاحی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی جناب کے. رحمٰن خاں (ڈپٹی چیئر مین راجیہ سبھا) نے کہا کہ ''مسلمان آج سائنسی و تعلیمی میدان میں بہت پیچھے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد اپنی ذمے داری کو سمجھتے ہوئے آگے آئے۔'' اس سیمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے جناب سید حامد (چانسلر ہمدرد یونیورسٹی) نے کہا کہ سائنسی میدان میں بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ جناب سید حامد نے کہا کہ ہم تعلیمی میدان میں بہت پیچھے ہیں اور ساتویں درجہ تک آتے آتے ہمارے 93 فیصد مسلم طلبہ پڑھائی چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔

مہمانِ اعزازی ڈاکٹر ایم مجید (امریکہ) نے کہا کہ مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کے رجحان کو فروغ دینے کی سخت ضرورت ہے۔ پروفیسر شمیم جیراجپوری سابق وائس چانسلر مولانا آزاد یونیورسٹی نے اپنے مقالے میں آزادی کے بعد سائنس کے میدان میں مسلمانوں کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر محمد اقبال (شیخ الجامعہ جامعہ ہمدرد) نے نباتاتی سائنس میں مسلمانوں کے ذریعے کی گئی مختلف تحقیقات پر روشنی ڈالی۔ جناب نوید حامد ممبر نیشنل کمیٹی فار مانیٹرنگ مائنریٹی ایجوکیشن نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب اور اس کے تدارک پر روشنی ڈالی۔

مولانا کلب صادق نے کہا کہ اسلام نے کبھی بھی سائنس کی مخالفت نہیں کی بلکہ سائنس اور حکمت ہمارے ایمان کو اور زیادہ مضبوط کرتی ہیں۔ ڈاکٹر رحمت اللہ نے سائنسی ٹیلنٹ سرچ پروگرام اور محمد حسین شامو نے اسکولی طلبہ اور سائنس کی کوچنگ پر مقالے پیش کیے۔

پروفیسر ایس. ایم. آر. انصاری نے ماضی میں ہندوستانی مدرسوں میں رائج سائنسی نصاب، جناب ارشد منصور غازی نے نصاب کی تیاری میں آنے والی پریشانی اور اس کے اسباب اور تدارک، ڈاکٹر ذکی کرمانی نے مدارس کے لیے نئے نصاب کی تیاری اور سائنس کی تعلیم پر مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر رفیق سرخواس نے بھی جلسے میں اظہارِ خیال کیا۔

سیمینار کے اختتامی اجلاس کے مہمانِ خصوصی جسٹس سہیل اعجاز صدیقی اور مہمانِ ذی وقار ڈاکٹر فاروق تھے۔ اس نشست کے آغاز میں ڈاکٹر محمد ذکی کرمانی نے ماس (مسلم ایسوسی ایشن فار ایڈوانسمنٹ آف سائنس) کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرایا۔ ماس کے صدر ڈاکٹر رفیق سرخواس نے بتایا کہ یہ تنظیم 1983 سے مسلمانوں میں سائنس کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس کے لیے سائنس داں، ماہرِ تعلیم اور اسلامی اسکالر مستقل طور پر کام کر رہے ہیں تاکہ مدرسوں، اسکولوں اور عام انسانوں میں سائنسی ذہن پیدا کیا جا سکے۔

آخر میں مندرجۂ ذیل قراردادیں پاس کی گئیں:

1. والدین اور اساتذہ ان طلبہ کی حوصلہ افزائی کریں جو سائنس میں دلچسپی رکھتے ہیں اور مستقبل میں سائنس کے مضمون میں تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

2. پرنسپل اور منیجر اپنے اسکول میں دسویں اور بارھویں درجے کی سطح پر تجربے کرنے کا ماحول پیدا کریں اور ابتدائی سطح پر ان کو ہر ممکن سہولت دیں تاکہ ان کے مشاہدے اور استنباط کی صلاحیت کو جلا ملے۔

3. اسکول انتظامیہ کمیٹی سائنسی تجربہ گاہوں اور کتب خانوں کی ترقی کے لیے رقم مہیا کرے اور اسکول سطح پر ایسا ماحول پیدا کرے جس سے بچوں کو سائنس پڑھنے میں دلچسپی پیدا ہو۔

4. اساتذہ، صدر مدرس اور علمائے کرام ان مدارس کے تعلیمی ماحول میں سائنسی تفکر اور تدبر کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں جس سے طلبہ قرآنی تعلیمات کے حساب سے کائنات اور کائنات میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھ سکیں۔

5. یونیورسٹیاں سائنس کے ہر طالب علم کے لیے سائنس کی تاریخ اور سائنس اور اخلاقیات کی تعلیم کو لازمی قرار دیں۔

6. حکومت یونیورسٹیوں میں سائنسی تحقیقات اور متعلقہ سہولیات کو مضبوط بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ فنڈ مہیا کرائے تاکہ ملک میں سائنسی ترقی کی رفتار تیز ہو سکے۔

7. وزارت ترقی انسانی وسائل اور وزارت سائنس و ٹیکنالوجی فروغ سائنس کے لیے کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کے کارکنان کو پورا تعاون دیں۔

8. حکومت خصوصی طور پر ان غیر سرکاری تنظیموں کی حوصلہ افزائی کرے جو دیہی علاقوں میں سائنسی تعلیم اسکولوں میں مہیا کرا رہے ہیں۔ (ڈاک سے)

تعلیمی کانفرنس

● جودھپور۔ مولانا آزاد سینئر سیکنڈری اسکول میں مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کی طرف سے منعقدہ کانفرنس کے مہمان خصوصی مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے کہا کہ حکومت اقلیتوں کی تعلیم کے لیے سنجیدہ ہے اور اس کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ اقلیتوں کے تعلیمی انتظامات کی خاطر متحدہ ترقی پسند محاذ حکومت کی پہل پر وزارت ترقی انسانی وسائل نے ایک کمیشن کی تشکیل کی ہے اور اقلیتوں کے لیے علاحدہ طور پر ایک سیل قائم کر کے اقلیتوں کے لیے چل رہے تعلیمی پروگرام کی خاطر مزید ترقیاتی انتظامات کیے ہیں۔ وزارت ترقی انسانی وسائل اقلیتوں کو آئین کے مطابق ان کے حقوق کے حصول کی خاطر کئی اقدامات اٹھا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ دنوں تعلیمی نصاب میں تبدیلیاں کر کے نقصان پہنچانے کا کام ہوتا رہا ہے، اس کی اصلاح کر کے ہندوستان کی ہر پسماندہ قوم کی تعلیمی ترقی کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ جناب ارجن سنگھ نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں مارواڑ مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی کوششوں کی تعریف کی۔ صدر جلسہ کانگریس کے کل ہند جنرل سکریٹری جناب اشوک گہلوت نے بھی مولانا ابوالکلام آزاد اسکول اور سوسائٹی کی کوششوں کی ستائش کی۔ جے نرائن ویاس یونیورسٹی، جودھپور کی وائس چانسلر ڈاکٹر نسیم بھاٹیہ نے اس موقعے پر کہا کہ یونیورسٹی میں اردو درس و تدریس کا آغاز ہو چکا ہے اور جلد ہی اردو کا الگ شعبہ قائم کرنے کے لیے بھی وہ مسلسل کوشاں ہیں۔ ڈاکٹر نرائن سنگھ مانک لاو (ایم. پی.) اور مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن، دہلی کے نائب صدر حبیب اے. فقیہ نے بھی جلسے میں خطاب کیا۔ انھوں نے سماجی بہبود کی مرکزی وزیر اور مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن، دہلی کی صدر محترمہ میرا کمار کا پیغام پڑھ کر سنایا کہ اس سال فاؤنڈیشن کی جانب سے راجستھان کی چار اقلیتی تنظیموں کو خصوصی امداد دی جا رہی ہے۔ اس امداد کے چیک جناب ارجن سنگھ نے اسلامیہ سیکنڈری اسکول، سیکر کو 30 لاکھ روپے، خواجہ غریب نواز ایجوکیشنل سوسائٹی رینوال، جے پور کو 13 لاکھ روپے اور جناب اشوک گہلوت نے محمدیہ ویلفیئر سوسائٹی نوائی، ٹونک کو 10 لاکھ روپے اور دارالعلوم اہل سنت باسنی، ناگور کو 10 لاکھ روپے کے امدادی سند نامے تنظیمات کے نمائندوں کو پیش کیے۔

ابتدا میں سوسائٹی کے سکریٹری محمد عتیق نے سوسائٹی کی کارکردگی کی تفصیلات بیان کیں۔ اس موقعے پر مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی طرف سے دس ہزار روپے کا وظیفہ حاصل کرنے والی اسکول کی 21 طالبات کو توصیفی سند نامے بھی دیے گئے۔ (ڈاک سے)

''اسکولوں اور کالجوں میں اردو تعلیم کے مسائل'' پر سیمینار

● چنئی، 17 اپریل۔ مرتضویہ ایجوکیشنل اینڈ کلچرل فاؤنڈیشن آف ساؤتھ انڈیا، انجمن ترقی اردو (ہند) تمل ناڈو اور تمل ناڈو اردو فاؤنڈیشن کے اشتراک سے ''اسکولوں اور کالجوں میں اردو تعلیم کے مسائل'' پر ایک روزہ سیمینار منعقد کیا گیا جس کا افتتاح کرتے ہوئے نواب محمد عبدالعلی وائس چیئر مین تمل ناڈو اردو اکادمی نے کہا کہ اردو اکادمی کا بجٹ صرف 15 لاکھ روپے سالانہ ہے جبکہ دیگر پڑوسی ریاستوں میں یہ دو کروڑ روپیہ سالانہ سے بھی زیادہ ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ حکومت اکادمی کے فنڈ میں اضافہ کرے۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے مرتضویہ ایجوکیشنل اینڈ کلچرل فاؤنڈیشن آف ساؤتھ ایشیا اور انجمن ترقی اردو ہند تمل ناڈو کے بانی صدر ڈاکٹر ایس کے قادری نے کہا کہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو تعلیم کے زوال کے لیے اردو داں طبقہ بھی بہت حد تک ذمے دار ہے۔ انھوں نے اردو ذریعۂ تعلیم والے طلبہ کے لیے تمام مضامین کی درسی کتابوں کی بروقت فراہمی کے لیے وزیر اعلیٰ سے تعاون کی درخواست کی۔ ڈاکٹر سید صفی اللہ وائس چیئر مین تمل ناڈو اردو اکادمی نے اساتذہ کو تدریسی معیار بہتر بنانے کا مشورہ دیا۔

سیمینار میں اردو میڈیم اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کی خالی اسامیاں پُر کرنے اور بی. ایڈ. ٹریننگ کورس میں اردو طلبہ کے لیے دس فیصد سیٹیں مخصوص کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔

ڈاکٹر ایس نذیر محمد، ڈاکٹر پی نثار احمد صدر شعبۂ عربی، فارسی اور اردو مدراس یونیورسٹی، ڈاکٹر سلمیٰ صلاح الدین، ڈاکٹر محمد فضل الدین اور حسین خاں نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔ ابتدا میں سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر جی. ایس. ایم. پی. قادری نے استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے ریاستی حکومت کی نوکریاں حاصل کرنے میں دشواری ہے لیکن پرائیویٹ سیکٹر جو مسلسل وسیع ہو رہا ہے اس میں ان طالب علموں کا مستقبل روشن ہے۔ (ڈاک سے)

اردو ریفریشر کورس

● پٹنہ، 2 مئی۔ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں یو جی سی کے تعاون سے 11 اپریل سے شروع ہونے والا پہلا اردو ریفریشر کورس یکم مئی کو ختم ہوا۔ اس کی اختتامی تقریب کی نظامت کرتے ہوئے پروفیسر اسلم آزاد نے بتایا کہ پٹنہ یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی بار اردو ریفریشر کورس منعقد ہوا۔ اس میں ملک کے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی اور اساتذہ کو اردو زبان و ادب کی موجودہ صورتِ حال سے واقف کرایا۔ اس کورس کا موضوع ''اردو ادب کی نئی کروٹیں'' تھا اور اس میں پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر

لطف الرحمٰن، محمود واجد (پاکستان)، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، سید محمد عقیل رضوی، غضنفر، ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر ابوذر عثمانی، پروفیسر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر علی جاوید، ذکیہ مشہدی، شفیع مشہدی، اعجاز علی ارشد، طلحہ رضوی برق، شمیم فاروقی، سید احتشام الدین، ڈاکٹر رفیع اللہ اور پروفیسر قمر اعظم ہاشمی کے علاوہ ملک کے مختلف علاقوں سے اردو کے اہم نقادوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔

اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے صدر جلسہ سید احتشام الدین پرووائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی، مہمان خصوصی پروفیسر موسیٰ رضا، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، سید شفیع مشہدی اور پروفیسر اے کے گپتا نے ریفریشر کورس کی افادیت پر روشنی ڈالی اور نظامِ تعلیم کو متحرک، فعال اور بااثر بنانے پر زور دیا تاکہ طلبہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کی طرف زیادہ رجوع نہ کریں۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر لطف الرحمٰن نے ادب اور ادیب کی عظمت، روایت سے استفادہ اور ادب میں قوتِ حیات (Vitality) کے موضوعات پر اقبال کے حوالے سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ ادب اتنا بڑا تخلیقی عمل ہے کہ کہا جاتا ہے کہ انسانی شعور و ادراک کے پاس فنونِ لطیفہ سے بہتر کوئی تحفہ نہیں جو آنے والی نسلوں کو دیا جاسکے۔ کسی قوم کی ثقافت، تہذیب اور اخلاقی تربیت نئی نسل تک صرف ادب سے منتقل ہوتی ہے۔ ہمیں از سر نو اپنے تمام کلاسیکی ادب کا جائزہ لینا چاہیے کیونکہ ہر ادب اپنے عہد کی اخلاقی اور روحانی بصیرتوں کا حامل ہوتا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر سید احتشام الدین کے دستِ مبارک سے اساتذہ کو سندیں بھی تقسیم کی گئیں۔ آخر میں شعبے کے استاد پروفیسر اسرائیل رضا نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کورس کے کامیاب انعقاد کے لیے پروفیسر اسلم آزاد، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی (پٹنہ یونیورسٹی) ڈاکٹر ابوبکر رضوی (متھلا یونیورسٹی) ڈائرکٹر اکیڈمک اسٹاف کالج (پٹنہ یونیورسٹی) کا بھی شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر عبدالخالق، احمد یوسف، عبدالصمد، مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر انیس فاطمہ، ڈاکٹر اشرف جہاں، ڈاکٹر فرزانہ اسلم، ڈاکٹر افسانہ خاتون کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات موجود تھے۔

(ڈاک سے)

امیر خسرو یادگاری خطبہ

● دہلی۔ نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کی طرف سے غالب انسٹی ٹیوٹ میں معروف مورخ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی نے امیر خسرو یادگاری خطبہ بعنوان ''امیر خسرو ایک سیاسی اور سماجی مفکر'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو کے سیاسی اور سماجی نظریات پر اب تک خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی جاسکی ہے۔ اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سے قبل پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی ہندوستان کی وسطی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں لہٰذا اس موضوع پر ان کی گفتگو خسرو کی شاعری اور ان کی سیاسی اور سماجی زندگی کو نئے جہت سے سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔ امیر خسرو کے حوالے سے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ امیر خسرو ہندوستان کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے باہر کی دنیا میں آج سے ساڑھے چھ سو سال پہلے ہندوستان کا بھرپور تعارف کرایا، ساری فارسی دنیا میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔

صدر جلسہ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ امیر خسرو کا نام ہندوستان کے فارسی شعرا میں ہمیشہ سے عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا رہا ہے۔ غالب جو بمشکل ہی کسی کو اہمیت دیتے تھے، انھوں نے بھی فنِ شاعری میں خسرو کا لوہا مانا ہے۔ اس خطبے کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی نے تمام سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

فخر الدین علی احمد یادگاری خطبہ

● نئی دہلی، 19 مئی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی طرف سے سابق صدر جمہوریۂ ہند فخر الدین علی احمد کی صد سالہ یوم پیدائش کے موقعے پر ڈاکٹر کرن سنگھ نے فخر الدین علی احمد یادگاری خطبہ بعنوان ''موجودہ ہندوستان: چیلنج اور ردِعمل'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت ملک کو کئی مبارزات (چیلنج) کا سامنا ہے جن میں بدعنوانی، بگڑتی اقتصادیات، معاشرے کا بگڑتا ڈھانچہ، پڑوسی ممالک سے بگڑتے تعلقات اور مذہبی منافرت جیسے مسائل اہم ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ آبادی کا ایک بڑا حصہ غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا حق اُن تک نہیں پہنچ پا رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ معاشرے میں ان قدروں کو فروغ دیں جو ایک سنجیدہ معاشرے کا تصور پیدا کرتی ہیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ہندوستان اور پاکستان کو ساری تلخیوں کو بھلا کر سنجیدگی سے تمام مسائل کا حل نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے یورپ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ یورپ کے کئی ممالک چھ سو سال تک آپس میں لڑتے رہے مگر اب وہ باہمی اتفاق کے ذریعے بغیر کسی بندش کے ایک دوسرے کے ملک آجا سکتے ہیں۔ ابتدا میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی نے خطاب کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ تقریر کی۔ جناب محمد شفیع قریشی نے اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر کرن سنگھ کے افکار و خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم نے ان تمام چنوتیوں کا مقابلہ نہیں کیا تو ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ خطبے کے آغاز میں استاد اقبال خاں نے غالب کی ایک غزل پیش کی اور اختتام خواجہ حسن ثانی نظامی کے کلمات تشکر سے ہوا۔ (ڈاک سے)

ترانۂ ہندی کی صدی تقریبات

● ممبئی، 9 رمئی۔ اقبال کے ترانۂ ہندی" سارے جہاں سے اچھا....." کے سو سال پورے ہونے پر مولانا آزاد کلچرل فورم، ممبئی کی طرف سے ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اقبال نے یہ ترانہ 1904 میں تحریر کیا تھا، جسے ہندوستان کے دوسرے قومی ترانے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر محمود الرحمٰن، سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کی۔

جلسے کا آغاز" سارے جہاں سے اچھا....." سے ہوا۔ ڈاکٹر معین الدین جینابڑے، صدر شعبۂ اردو نے جلسے کی نظامت کی۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے "ترانۂ ہندی کا تاریخی پس منظر اور اس کی عصری معنویت" پر افتتاحی مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اس نظم کی تاریخ بیان کرتے ہوئے قومی تحریکِ آزادی میں اس کے اہم رول پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ مہاتما گاندھی اس نظم اور اقبال کے مداح تھے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال ایک محب وطن شاعر تھے اور 1904 سے لے کر 1937 تک وہ حب وطن کے حوالے سے نظمیں کہتے رہے۔

جلسے میں مضطر مجاز، پروفیسر احمد انصاری، ڈاکٹر صاحب علی، ڈاکٹر خورشید نعمانی نے بھی اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ مشہور شاعر عبدالاحد ساز نے اقبال کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ آخر میں ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اس جلسے کے انعقاد پر پروفیسر عبدالستار دلوی اور ان کے رفیق اور نائب صدر پروفیسر احمد انصاری (سابق صدر شعبۂ فارسی، ممبئی یونیورسٹی) اور دیگر منتظمین کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اقبال کی شاعری ہر موقع کی شاعری ہے اور اس سے کام کرنے والوں کو حوصلہ ملتا ہے۔

اس تقریب کے دوسرے حصے میں مشہور گلوکارہ سیما سہگل نے اقبال کی نظمیں ترنم سے پیش کیں اور پھر مشہور گلوکار مرتضیٰ خاں اور محترمہ شہر بانو نے بھی اقبال کی غزلیں پیش کیں۔ (ڈاک سے)

● کالی کٹ، 21 راپریل۔ کالی کٹ میں واقع علامہ اقبال انڈین ہیومینٹیرین فاؤنڈیشن میں "ترانۂ ہندی" کا صد سالہ جشن منایا گیا۔ اس موقعے پر زندہ رود نگر میں فاؤنڈیشن کی طرف سے قائم علامہ اقبال اکادمی کا افتتاح کیرالا کے گورنر جناب آر. ایل. بھاٹیہ نے کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ ترانۂ ہندی نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ گاندھی جی نے جیل میں سیکڑوں بار یہ ترانہ گا کر لوگوں میں آزادی کا جوش و جذبہ پیدا کیا۔ اقبال نے اپنی نظموں کے ذریعے آپسی بھائی چارہ، پیار محبت اور اخوت کا پیغام دیا ہے۔

جلسے میں خطبۂ استقبالیہ عبدالصمد صمدانی (ممبر پارلیمنٹ) اور صدارتی خطبہ تھوناتل رویندرن نے پیش کیا۔ نبیل حارث کے اظہار تشکر پر جلسے کا اختتام ہوا۔

(ڈاک سے)

یونانی طبی بورڈ کا جلسہ

● نئی دہلی، 23 رمئی۔ "طب یونانی کو فروغ دینے کے لیے اس کا رشتہ اردو زبان کے ساتھ بحال رکھنا ضروری ہے۔" اس خیال کا اظہار سینٹرل یونانی طبی بورڈ کے جلسے میں مقررین نے کیا۔ اجلاس کی صدارت حکیم اخلاق احمد نے کی جبکہ مہمانِ خصوصی دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری متین احمد (ایم. ایل. اے.)، غازی آباد کے ضلع جج شکیل احمد خاں اور ڈی. ایچ. او، ایم. سی. ڈی. (دہلی) ڈاکٹر محمد احمد تھے۔ اس موقع پر دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی اور ہفتہ وار "خبردار" کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی نے بھی خطاب کیا۔ اجلاس میں اس بات پر تشویش کا اظہار کیا گیا کہ اطبا کی اکثریت جو پہلے اردو میں اپنا کام کاج کرتی تھی، آج دیگر زبانوں کو اپنا رہی ہے۔ جلسے میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ ادویہ کی معیار بندی کے ساتھ قیمتوں پر لگام دی جائے تاکہ وہ عام آدمی کی پہنچ سے باہر نہ ہو سکیں۔

اجلاس میں طب یونانی کے فروغ میں نمایاں حصہ لینے والے جن حضرات کو استقبالیہ دیا گیا اور ایوارڈ پیش کیے گئے ان میں سی سی آئی ایم دہلی کے نومنتخب ممبر ڈاکٹر راشد اللہ خاں، ممبر اسمبلی چودھری متین احمد اور ایم اے ایف اکادمی کے بانی محمد ابوالفضل فاروقی شامل ہیں۔ حکیم اخلاق احمد نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اطبا معیار کو قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں جو طب یونانی کی شناخت رہا ہے۔ انھوں نے طبی نسخوں سے اردو کے مٹتے ہوئے چلن کو تشویشناک قرار دیا۔ مرغوب حیدر عابدی نے طب یونانی کے فروغ اور اس میں اردو کے چلن کو برقرار رکھنے کے لیے اردو اکادمی کے تعاون کی پیش کش کی۔ (ڈاک سے)

کیفی اعظمی کی یاد میں جلسہ

● نئی دہلی، 12 رمئی۔ "ملک میں فسطائی طاقتوں کو زیر کرنے کے لیے عوام کا بیدار ہونا بے حد ضروری ہے۔" ان خیالات کا اظہار دہلی یونیورسٹی شعبۂ ہندی کے سابق صدر ڈاکٹر وشوناتھ ترپاٹھی نے کیفی اعظمی فاؤنڈیشن کی طرف سے پریس کلب میں کیفی اعظمی کی یاد میں منعقد جلسے میں کیا۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ آج کیفی اعظمی کے کارناموں کو سمجھنے اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر علی جاوید نے کیفی اعظمی فاؤنڈیشن کے مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ رضا امام نے کہا کہ کیفی اعظمی نے بے حد سادہ زبان میں شاعری کی۔ صحافی راہل جلانی نے جلسے کی صدارت کی۔ اس موقع پر کرشن پرساد نے کیفی اعظمی کی ایک نظم پیش کی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

مشاعروں کے زوال پذیر منظرنامے پر مذاکرہ

● میرا روڈ (تھانہ)، 11 / مئی۔ "میرا بھائندر رائٹرز فورم" کی طرف سے افسانہ نگار فیاض رفعت کے مکان پر ایک ادبی محفل منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر مشاعروں کے زوال پذیر منظرنامے کے اسباب اور اس کے تدارک پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ ابتدا میں مشاعرے بادشاہوں کے درباروں یا خانقاہوں میں منعقد کیے جاتے تھے۔ ان میں ایسے سامعین کو بلایا جاتا تھا جو فارسی اور اردو کے پس منظر سے واقف ہوتے تھے۔ مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔ انھوں نے مشاعروں کے ماضی، حال اور مستقبل پر مذاکرے منعقد کرنے کا مشورہ دیا۔

فیاض رفعت نے کہا کہ مشاعرے اب صرف تفریح کا ذریعہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اس موقعے پر حامد اقبال صدیقی نے بھی اظہار خیال کیا۔ بعد ازاں ایک شعری نشست منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، فیاض رفعت، ظفر کلیم، ملک زادہ جاوید، شمیم عباس، حامد اقبال صدیقی، فرحان حنیف، کمل مینائی، پروفیسر سعید خاں، سکندر مرزا اور عظیم ملک نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ آخر میں میرا بھائندر رائٹرز فورم کی جانب سے فرحان حنیف نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

مابعد جدیدیت پر لیکچر

● حیدرآباد، 3 / مئی۔ ممتاز نقاد اور عروض داں جناب سکندر احمد کے ساتھ ایک مکالماتی اجلاس ادارہ الانصار کی طرف سے منعقد ہوا جس کی صدارت رؤف خیر نے کی۔ سب سے پہلے اسد ثنائی مدیر "الانصار" نے سکندر احمد کا تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر سکندر احمد نے مابعد جدیدیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک رجحان ہے۔ مابعد جدیدیت کے پاس جو معنی کی تکثیریت کی اصطلاح ہے اس کے مطابق معنی کسی بھی وجہ سے اپنے لفظ سے دور ہوتا چلا جاتا ہے، تحریر پر تقریر کو جو فوقیت ہے اسے مابعد جدیدیت تسلیم نہیں کرتی۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو دنیا کے جتنے بھی مقدس صحیفے ہیں وہ سب زبانی ہیں اور مابعد جدیدیت کا رجحان وید، قرآن وغیرہ پر یقین نہیں رکھتا۔ مابعد جدیدیت کے حساب سے اقدار کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ مابعد جدیدیت کے حوالے سے جو سب سے مشہور کتاب ہے وہ ہے "The Satanic Verses" جو بدنام زمانہ مصنف سلمان رشدی کی لکھی ہوئی ہے۔ دراصل مابعد جدیدیت، سرمایہ دارانہ نظام کی ثقافتی منطق ہے، اس کا جائزہ یوں بھی لیا جا سکتا ہے کہ پہلے ضرورت پیدا ہوتی تھی پھر سامان بنایا جاتا تھا، اب سامان پہلے بنا کر ضرورتیں ایجاد کی جاتی ہیں اور لوگوں کو اس کا عادی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ جن تہذیبوں کے پاس بنیادی طور پر کوئی تاریخ نہیں ہے یہ ان کا نظریہ ہے۔ رہی بات ڈی کنسٹرکشن کی تو دریدا نے یہ لفظ فرائڈ سے لیا ہے اور اس کا اردو ترجمہ رد تشکیل غلط ہے۔ اس کا ترجمہ تحرّ ی تعمیر ہونا چاہیے۔ سکندر احمد کے بعد رؤف خیر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہر نئی بات، جو کہی جاتی ہے اسے رد کر دیا جاتا ہے سیٹینک ورسس کے بارے میں ہزار تاویلات کی گئی ہیں لیکن جہاں تک ادب کا تعلق ہے وہاں کوئی بات منوائی نہیں جا سکتی، ہم اپنے اقدار کی روشنی میں سب کچھ کہتے چلے آ رہے ہیں۔ البتہ موضوعات کو رد و قبول کے مرحلے سے گزرنا ایک الگ بات ہے۔ کوئی بات اپنے آپ رد نہیں ہوتی۔ آخر میں مضطر مجاز نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔

(ڈاک سے)

اساتذہ کے لیے تربیتی پروگرام

● حیدرآباد۔ کمشنریٹ آف کالجییٹ ایجوکیشن، آندھرا پردیش کی جانب سے ریاست میں واقع سرکاری ڈگری کالجوں کے اساتذہ کے لیے اردو تربیتی پروگرام 15 سے 19 مارچ تک منعقد کیا گیا۔ اس کا مقصد اردو کی اعلیٰ تعلیم اور درس و تدریس کے فن کو جدید تعلیمی ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنا تھا تاکہ اردو میڈیم اساتذہ میں تدریسی مہارت فروغ پا سکے۔ جناب احمد محی الدین اکیڈمک آفیسر اردو کورس اس کے روح رواں تھے۔ افتتاحی اجلاس میں ڈائرکٹر اعلیٰ تعلیم کے لکشمی نارائن (آئی اے ایس) نے کہا کہ استاد ایک رہنما کی طرح ہوتا ہے جو قوموں اور نسلوں کی ذہنی آبیاری کرتا ہے۔

افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی روزنامہ "سیاست" کے مدیر اعلیٰ جناب زاہد علی خاں نے کہا کہ عالم گیریت کے اس دور میں اردو زبان کو کمپیوٹر اور عصری ٹیکنالوجی سے لیس کرنا ہوگا۔ انھوں نے زبان میں ترجمے کے عمل کو جاری رکھنے اور تکنیکی الفاظ کا ترجمہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ 15 / مارچ کے دوسرے سیشن میں پروفیسر ایف ڈی وکیل نے اقدار پر مبنی تعلیم پر لیکچر دیا۔

16 / مارچ کے پہلے سیشن میں پروفیسر فریدہ خاتون نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ ایک استاد کو کن صلاحیتوں کا مالک ہونا چاہیے۔ پروفیسر یوسف کمال نے قومی اردو کونسل کی اردو خدمات کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ یہ ادارہ اردو میں نہ صرف علمی و ادبی اور سائنسی کتابیں شائع کرتا ہے بلکہ اس نے اردو کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سریش کمال، غضنفر علی خاں نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروفیسر اشرف رفیع نے اردو شاعری کی جدید و کلاسیکی اصناف کا احاطہ کیا۔ اسلم فرشوری نے سماج پر الکٹرانک میڈیا کے مثبت و منفی اثرات اور ذرائع ابلاغ کے رول پر گفتگو کی۔

ڈاکٹر ششی نے ایچ آئی وی ایڈس پر لیکچر دیا۔ 19 / مارچ کو اختتامی اجلاس

کے مہمان خصوصی پروفیسر سلیمان صدیقی وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو داں طبقے کے طلبہ کو عالمی سماج میں اپنا مقام بنانے کے لیے انگریزی اور دیگر زبانوں پر عبور حاصل کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر کے لکشمی نارائن نے بھی شرکا کو خطاب کیا۔ احمد محی الدین نے کورس کے موضوعات مرتب کیے۔ اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں اسپیشل آفیسر اردو کورس کو آرڈینیٹر احمد محی الدین، انتھونی راج، اکاڈمک گائیڈنس آفیسر پی جگدیشور ریڈی، اوشارانی اور شیام نے نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ تربیتی پروگرام جگدیش ور ریڈی کے اظہار تشکر پر اختتام کو پہنچا۔ (ڈاک سے)

جدہ میں اردو یونیورسٹی کا امتحانی مرکز

● حیدرآباد، 13 رمئی۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کی جانب سے سعودی عرب میں ہندوستانی سفارتخانے کے تعاون سے رواں تعلیمی سال یعنی 2006-2005 سے ہندوستانیوں کی سہولت کے لیے جدہ میں امتحانی مرکز کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کرنے کی ہدایت جاری کردی گئی ہے۔ آئندہ تعلیمی سال سے سعودی عرب کے دوسرے شہروں میں بھی اردو یونیورسٹی کے اسٹڈی سینٹروں کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ جدہ کی تعلیمی ایجنسیوں کے ساتھ رابطہ قائم کرکے یونیورسٹی کے انڈر گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ اور دیگر کورسوں میں غیر مقیم ہندوستانیوں کو داخلہ اور فاصلاتی نظام تعلیم کا امتحان لکھنے کی سہولت فراہم کی جائے گی۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ڈاکٹر اوصاف سعید کونسلر جنرل ہند، متعینہ سفارت خانہ جدہ کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اوصاف سعید نے کہا کہ سعودی عرب میں مقیم تقریباً سولہ (16) لاکھ ہندوستانیوں میں سے تیس تا پینتیس فیصد کا تعلق آندھرا پردیش سے ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تعداد دنیا کے کسی بھی ملک میں مقیم ہندوستانیوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ ڈاکٹر سعید نے کہا کہ سعودی عرب میں مقیم ہندوستانی طلبہ کو بارھویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کی سہولت حاصل ہے لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے انھیں ہندوستان یا دوسرے ممالک کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوستانی یونیورسٹیوں کے تعلیمی مراکز کا سعودی عرب میں قیام سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے اسٹڈی سینٹر اور امتحانی مرکز کے جدہ میں قیام کے لیے اپنی جانب سے تمام سہولتیں فراہم کرنے کا یقین دلایا۔ (ڈاک سے)

م۔ افضل انگولا میں ہندوستان کے سفیر مقرر

● نئی دہلی، 14 رجون۔ راجیہ سبھا کے سابق ممبر اور اردو کے معروف صحافی جناب م۔ افضل کو انگولا میں ہندوستان کا سفیر مقرر کیا گیا ہے۔ وہ آزاد ہندوستان کے پہلے اردو صحافی ہیں جنھیں اس عہدے پر نامزد کیا گیا ہے۔

براعظم افریقہ کے شمال مغربی حصے میں واقع بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) کے ساحل سے ملا ہوا انگولا رقبے کے اعتبار سے پاکستان سے دوگنا ہے، مگر آبادی صرف سوا کروڑ ہے۔ نائیجیریا کے بعد انگولا افریقی ممالک میں دوسرا سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا ملک بن گیا ہے۔ تیل کی دریافت وہاں حال ہی میں ہوئی ہے۔ انگولا دنیا بھر میں اپنے ہیروں اور تانبے کی کانوں کے لیے بھی مشہور ہے اور دنیا کا دس فیصد ہیرا صرف انگولا میں پایا جاتا ہے۔

جناب م۔ افضل دہلی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''اخبار نو'' کے بانی مدیر، ہندوستان میں اردو اخبارات کی سب سے قدیم تنظیم آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے صدر، آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرس کانفرنس، انڈین فیڈریشن آف اسمال اینڈ میڈیم نیوز پیپرز ایڈیٹرس کانفرنس، انڈین فیڈریشن آف اسمال اینڈ میڈیم نیوز پیپرز فیڈریشن اور پبلیشرس آف انڈیا کے رکن ہیں۔ ان دنوں اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین کے عہدے پر فائز ہیں۔ (ڈاک سے)

بشیر بدر مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے نئے چیئرمین

● بھوپال، 11 رمئی۔ اردو کے مشہور شاعر بشیر بدر مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے نئے چیئرمین بنائے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ وہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی و سنسکرت کی ترقی کے لیے بھی کام کریں گے۔ واضح رہے کہ عزیز قریشی کی مدت ختم ہونے کے بعد کافی عرصے سے اکادمی کے چیئرمین کا عہدہ خالی تھا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

امیر خسرو قومی اعزاز

● جمشید پور، 15 رمئی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) جمشید پور کی طرف سے امیر خسرو قومی اعزاز تقریب منعقد ہوئی جس میں ممتاز شاعر پرکاش فکری کو امیر خسرو اعزاز دیا گیا۔ تقریب کی پہلی نشست کی صدارت سید رضا عباس رضوی محسن صدر انجمن ترقی اردو (ہند) جمشید پور نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید جعفر رضا (سابق صدر شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی)، پروفیسر ابوذر عثمانی (صدر انجمن ترقی اردو (ہند) رانچی، جھارکھنڈ اور ڈاکٹر منظر حسین بھی موجود تھے۔ جلسے کی نظامت انجمن کے جنرل سکریٹری شمس فریدی نے کی۔ سید رضا عباس رضوی محسن نے خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انجمن کا یہ دوسرا سالانہ امیر خسرو قومی اعزاز کا جلسہ ہے۔ پہلا امیر خسرو اعزاز مایہ ناز ادیب و شاعر اور بلند پایہ نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کو 2003 میں پیش کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں شمس الرحمٰن فاروقی نے ''امیر خسرو اور ہم'' کے عنوان سے خطبہ پیش کیا تھا۔ اس موقعے پر ابوذر عثمانی نے امیر خسرو کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے چند اہم

باتوں پر روشنی ڈالی۔

جلسے میں پرکاش فکری کے مجموعۂ غزل "ایک ذرا سی بارش" کی رسم اجرا ڈاکٹر سید جعفر رضا کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ بعد ازاں ڈاکٹر منظر حسین نے "پرکاش فکری کی غزلیہ شاعری" کے عنوان سے مضمون پیش کیا۔ اس موقعے پر پرکاش فکری نے بھی اپنی شاعری سے متعلق گفتگو کی۔

دوسری نشست کی صدارت پروفیسر ابوذر عثمانی نے کی جس میں ڈاکٹر جعفر رضا نے پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے فرقہ وارانہ ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور ہندو مسلم بھائی چارے کے نظریات پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے آخر میں فنکار مجید شعلہ نے امیر خسرو کا صوفیانہ کلام پیش کیا۔

(ڈاک سے)

"بزمِ اطفال" کا جشنِ زریں

● مالیگاؤں، 9رمئی۔ ہفت روزہ "بزمِ اطفال" کی اشاعت کے دس سال مکمل ہونے کی خوشی میں ایک جلسے کا انعقاد عمل میں آیا جس میں قاضی مشتاق احمد، نذیر فتح پوری، ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، الیس خاں، محمد خلیل، ایس یوسف انصاری اور رفیع احمد کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

پہلی نشست کی صدارت متور پیر بھائی (صدر حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے) نے کی۔ انھوں نے سالنامہ بزمِ اطفال کا اجرا بھی کیا۔ اس موقعے پر 28 کتابوں کا اجرا ہوا۔ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے افسانہ نگار قاضی مشتاق احمد نے ادب اطفال کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ آج جب کہ مشترکہ خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا ہے، بچے اس بات سے پریشان ہیں کہ اب ان کی رہنمائی کے لیے خاندان میں کوئی بزرگ نہیں۔ اس خلا کو پُر کرنے کی ذمے داری ادبِ اطفال پر آگئی ہے۔ متور پیر بھائی نے کہا کہ ادب اطفال کے فروغ میں تعلیمی ادارے اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ "سائنس کی دنیا" کے سابق مدیر محمد خلیل نے سائنس کو ادب سے جوڑنے اور بچوں میں سائنس سے رغبت پیدا کرنے کا مشورہ دیا۔ جلسے میں ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، نذیر فتحپوری، اقبال نیازی، فاروق سید، اسحٰق خضر، ایم یوسف انصاری اور رفیع احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

تیسری نشست کی صدارت عبدالکریم سالار (ڈپٹی میئر مالیگاؤں) نے کی۔

اس موقعے پر ادب اطفال میں نمایاں خدمات کے لیے نذیر فتح پوری، عبدالرحیم نشتر، ڈاکٹر محبوب راہی، اسحٰق خضر، ایم یوسف انصاری، رفیع احمد، وکیل مجیب، اقبال نیازی، فاروق سید، رشید قاسمی، مشتاق کریمی، شکیل احمد اور انور سرکو ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے علاوہ آل مالیگاؤں کوئز مقابلے میں حصہ لینے والے بچوں کو سو سے زائد انعامات دیے گئے۔

دوسرے دن کتابوں کی نمائش ہوئی جس میں بچوں کے ادب سے متعلق کتابیں اور رسائل بڑی تعداد میں رکھے گئے تھے۔ اس نمائش کا افتتاح جناب متور پیر بھائی نے کیا۔ جلسے کی مختلف نشستوں کی نظامت یٰسین اعظمی اور حسین عاجز نے کی۔ کتابوں پر تبصرہ شبیر ہاشمی نے کیا۔ شکریہ کی رسم بزم اطفال کے مدیر رحمانی سلیم احمد نے ادا کی۔

(ڈاک سے)

تقسیم اسناد کے جلسے

● الٰہ آباد، 17رمئی۔ وصیۃ العلوم انفارمیشن ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ، الٰہ آباد میں قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جا رہے کمپیوٹر سینٹر کے تعلیمی سال 2003-04 کے طلبہ و طالبات کے لیے جلسۂ تقسیم اسناد اور سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت قومی اردو کونسل کے نائب صدر جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کی۔ انھوں نے اردو کو جدید تعلیم سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور اردو کی ترقی کے لیے کونسل کی طرف سے ہر ضروری قدم اٹھانے کی یقین دہانی کرائی۔ مہمانِ خصوصی جناب یونس خاں، چیف انجینئر آئی. ٹی. آئی. الٰہ آباد نے کہا کہ طلبہ کو اپنے کیریئر کے راستے میں منصوبہ بند طریقے سے آگے بڑھنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔

پروفیسر نجیب الحسن، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف رورل ٹیکنالوجی، الٰہ آباد نے اردو زبان کی ترویج و ترقی اور اس زبان کو کمپیوٹر سے جوڑ کر روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی ستائش کی۔ جلسے کی نظامت مولانا محمد امین ندوی نے کی۔ خطبۂ استقبالیہ ڈاکٹر برکت اللہ ندوی، لکچرر اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، الٰہ آباد نے پیش کیا۔ ڈاکٹر سعد عثمانی، ریڈر میڈیکل کالج الٰہ آباد اور جناب تحسین عثمانی، ڈی. جی. ایم.، آئی. ٹی. آئی.، الٰہ آباد، سید ظفر سبحان، جنرل منیجر شیرملائی سینڈیکیٹ لمیٹڈ نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔

(ڈاک سے)

● جھانسی، 15راپریل۔ قومی اردو کونسل کی طرف سے سیرت ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام چلائے جا رہے کمپیوٹر سینٹر میں تعلیمی سال 2004-05 کے فارغین کے لیے جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس میں پردیپ کمار جین (ایم. ایل. اے.) نے بطور مہمانِ خصوصی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، تعلیم ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔ انھوں نے کمپیوٹر تعلیم کے فروغ میں اس ادارے کی خدمات کی ستائش کی۔ انھوں نے تمام کامیاب طلبہ و طالبات میں ڈپلوما تقسیم کیا۔

جلسے کے آغاز میں سینٹر انچارج عبدالمجید نے بتایا کہ تعلیمی سال 2004-05 میں 41 طلبہ امتحان میں شریک ہوئے جن میں سے 39 طلبہ

فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے۔ ادارے کا رزلٹ 98 فیصد رہا۔ شگفتہ شیخ کو تمام طالب علموں میں اوّل مقام حاصل ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر اقبال حسین، قادر پیٹر سیلون، شمیم شیخ، بی کے سوامی، اعجاز احمد، منور خاں کے علاوہ وویا ڈونگرے، ہرش وردھن، شفیعہ فاطمہ وغیرہ طلبہ وطالبات نے بھی اظہار خیال کیا۔

(ڈاک سے)

مختلف زبانوں کا ادبی میلہ

● جلگاؤں (مہاراشٹر)۔ خاندیش ساہتیہ منڈل جلگاؤں نے مختلف زبانوں کا ایک ادبی میلہ منعقد کیا جس میں مختلف ریاستوں کے تقریباً ساٹھ ادیب شامل ہوئے۔ مہاراشٹر کے سابق وزیر تعلیم جناب سریش دادا جین نے اس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ مختلف زبانوں کے ادیب اپنے خیالات سے ایک آدرش سماج بنا سکتے ہیں۔ اقرا ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر جناب کریم سالار، جناب غفار ملک، جناب ڈھوکلے، ڈاکٹر امان اللہ شاہ اور صحافی جناب دیوکر نے جلسے میں اظہار خیال کیا۔

اس موقعے پر ڈاکٹر باپو دیسائی (ہندی)، جناب احتشام دیشمکھ (مراٹھی) ڈاکٹر محمد شفیع اور ڈاکٹر ساجد (اردو) نے تقریریں کیں۔ صدارتی خطبہ ممتاز ادیب ڈاکٹر تامبیکر نے پیش کیا۔ جلسے میں ادیب اور شاعر ڈاکٹر محمد شفیع نے ترجمے کی اہمیت اور اردو کے اہم ترجموں، ان کی تاریخ، طریقۂ کار اور ضرورت پر روشنی ڈالی۔ شام کو ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مختلف زبانوں کے تقریباً چالیس شعرا نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

فنکشنل عربی کورس کے طلبہ کا جلسہ

● نئی دہلی، 2/اپریل۔ ''اسلام کی روح کو سمجھنے کے لیے عربی سیکھنا ضروری ہے۔'' اس خیال کا اظہار معروف عالم دین مولانا غلام محمد وستانوی نے آل انڈیا تعلیمی وملی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام قومی اردو کونسل کے فنکشنل عربی ڈپلوما کورس کا پہلا سال مکمل ہونے پر طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک کسی چیز کو اسی زبان کی مدد سے حاصل نہ کیا جائے جس میں وہ ہے، اس کی اصل روح تک پہنچنا مشکل ہے۔ مولانا وستانوی نے پسماندہ علاقوں میں فاؤنڈیشن کی طرف سے تعلیمی بیداری کی مہم چلانے پر اس کے سربراہ مولانا اسرار الحق قاسمی کو مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر مولانا قاسمی اور فاؤنڈیشن کے نائب صدر مولانا افتخار حسین مدنی نے بھی خطاب کیا۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● علی گڑھ، 11/مئی۔ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ممتاز شاعر اور دانشور قاضی سلیم کی وفات پر ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر شہریار نے کی۔ صدر شعبۂ اردو، پروفیسر قاضی افضال حسین نے کہا کہ نام ونمود کی پرواہ کیے بغیر قاضی سلیم نے خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا۔ ان کی شاعری میں حیرت انگیز تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے قاضی سلیم کی وفات کو جدید اردو شاعری کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔ انھوں نے قاضی سلیم کی شاعری میں وقت اور موت کے کلیدی استعاروں پر خاص طور سے روشنی ڈالی جن کی بدولت قاضی سلیم کی شاعری کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قاضی سلیم کو اجتہادی شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ قاضی سلیم کی نظموں میں ارکان کی کمی بیشی اور بحروں کا اجتہاد تکنیک کے طور پر ہوا ہے، جب کہ دوسرے شاعروں کے یہاں یہی صورت حال ناکام تجربے کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ تعزیتی قرارداد ڈاکٹر راشد انور راشد نے پیش کی جس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ قاضی سلیم کی حیات اور ادبی کارناموں کا جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر شہریار نے قاضی سلیم سے اپنے دیرینہ مراسم اور تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی موت کو ذاتی سانحے سے تعبیر کیا۔

(ڈاک سے)

● ممبئی، 22/مئی۔ مہاراشٹر اردو رائٹرس گلڈ اور اعتراف گروپ ممبئی کی جانب سے قاضی سلیم کی رحلت پر ندا فاضلی کی صدارت میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی۔ مہاراشٹر اردو رائٹرس گلڈ کے صدر سلام بن رزاق نے کہا کہ موت قاضی سلیم کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ موصوف نے قاضی سلیم کی اہم نظم ''رستگاری'' پیش کی۔ یعقوب راہی نے کہا کہ قاضی سلیم نے بیانیہ نظمیں بھی لکھیں اور ان نظموں میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ جلسے میں پروفیسر ظہیر علی، رحمان عباس، فرحان حنیف نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اردو مراٹھی مترجم وقار قادری نے تعزیتی قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا کہ قاضی سلیم نے منفرد امیجری اور استعارے تخلیق کیے ہیں جو ان کی شناخت بن گئے ہیں۔ ندا فاضلی نے کہا کہ قاضی سلیم کی نظمیں ایک ہی قرأت میں سمجھ میں نہیں آتیں بلکہ بار بار قرأت کا مطالبہ کرتی ہیں، ان کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ سیاست سے وابستہ ہونے کے باوجود انھوں نے ادب کو سیاست سے دور رکھا۔ (ڈاک سے)

● جے پور، یکم مئی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) راجستھان کے زیر اہتمام معروف شاعر کنور نفاست حسین راہی شہابی کے انتقال (26 اپریل 2005) پر تعزیتی نشست منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر انجمن کے صدر الحاج انعام الحق، جنرل سکریٹری جناب مشتاق احمد راکیش، جناب ویدویاس (صدر راجستھان ساہتیہ اکادمی)، جناب منظور ادیب، پرکاش پاریک، تارا پرکاش جوشی، ابراہیم یوسف قاسمی، نسیم الدین پیارے میاں، جناب آفتاب احمد خاں (نواب ٹونک) اور

محترمہ شائستہ بالی نے راہی شہابی سے اپنے دیرینہ تعلقات اور ان کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالی۔ جلسے میں دردا کبرآبادی، مدان ہوش، لوکیش کمار ساحل، شاہد پٹھان، فاروق انجینئر، لطیف فہمی، عشرت دھولپوری، خوشتر سہارنپوری، تبسم رحمانی، پرکاش جوہری، حبیب بیگ پارس، ڈاکٹر ولی، ڈاکٹر تارا پرکاش جوشی، معین شادوی، ہنگک سکینہ وغیرہ نے مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ تعزیتی نشست کی صدارت اردو و ہندی کی ادیبہ محترمہ شائستہ بالی نے کی اور نظامت کے فرائض جناب عشرت دھولپوری نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● رانچی، 23/اپریل۔ غلام علی خاں ریسرچ اینڈ اسٹڈی سینٹر کی طرف سے تسلیم محل میں صدیق مجیبی کی شاعری پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ ابتدا میں ڈاکٹر سرور ساجد نے صدیق مجیبی کی شاعری کے مختلف نکات پر گفتگو کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی، جناب جے پی مشرا حیرت فرخ آبادی، پروفیسر آر کے جھا، ڈاکٹر منظر کلیروی اور ڈاکٹر جمشید قمر نے صدیق مجیبی کی شاعری پر مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر راشد انور راشد (استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے اپنے مقالے میں صدیق مجیبی کی شاعری کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ صدیق مجیبی موجودہ عہد کے اردو غزل گویوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ جلسے میں صدیقی مجیبی نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ پروفیسر وی. این. پانڈے نے جلسے کی صدارت کی اور نظامت ڈاکٹر سرور ساجد نے انجام دی۔ سیمینار کے بعد مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت جے پی مشرا حیرت فرخ آبادی اور نظامت سہیل سعید نے کی۔ مشاعرے میں قمرالزماں قمر، محترمہ راج شری جینتی راز، اعجاز انور، نصیر افسر، بانکے بہاری ہمدم، اوما شنکر ورما، سہیل سعید، کیلاش ورما، سرور ساجد، ہارون خمار، حیرت فرخ آبادی نے کلام پیش کیا۔

● میرا روڈ (تھانہ) 9/مئی۔ عظیم مَلِک کے شعری مجموعے "کہنا میں نے یاد کیا ہے" کا اجرا ڈاکٹر مَلِک زادہ منظور احمد نے کیا۔ اس موقعے پر اسکرپٹ رائٹر اور ہدایت کار ساگر سرحدی بھی موجود تھے۔ بعد ازاں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی نظامت حامد اقبال صدیقی نے کی۔ مشاعرے کا افتتاح ایڈووکیٹ یٰسین مومن نے کیا۔ مشاعرے میں ممتاز راشد، ظفر گورکھپوری، احمد وصی، عبدالاحد ساز، ندیم صدیقی، شمیم عباس، قاسم امام، عرفان جعفری، وپنی مشرا، شاہین اقبال، فرحان حنیف، قمر صدیقی، عبید اعظم اعظمی، جامی کلیانوی، سکندر مرزا عظیم ملک، اختر جمال، محسن امیدی، ظفر کلیم، طاہر نقاش، نعیم اختر، تسنیم انصاری، ملک زادہ جاوید اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے اپنے کلام سے نوازا۔

(ڈاک سے)

● جلگاؤں، 29/اپریل۔ اردو ڈی. ایڈ. کالج میں ولی میاں کی صدارت میں ایک ادبی جلسہ منعقد ہوا جس میں مہمانانِ خصوصی کے طور پر قیوم راز مارولوی، افسانہ نگار رشید قاسمی، صحافی مشتاق کریمی اور صابر مصطفیٰ آبادی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر مشتاق کریمی نے کہا کہ صحافت میں بیباکی، بے خوفی، دیانت داری اور غیر جانب داری بے حد ضروری ہے۔ رشید قاسمی نے مادری زبان کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ طالب علم کا صحیح املا سے روشناس ہونا ضروری ہے۔ قیوم راز نے صحیح تلفظ کی ادائیگی پر زور دیا۔ ولی میاں نے اردو داں طلبہ کے لیے ایس ایس سی امتحان کے بعد پونے کی طرز پر ٹیلنٹ سرچ کلاس کے اجرا کی ضرورت پر زور دیا۔ انیس پٹیل اور پرنسپل سلیم خاں نے بھی اس موقعے پر اظہارِ خیال کیا۔ نظامت صابر مصطفیٰ آبادی نے کی اور شائستہ حیدر نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● دربھنگہ۔ ادبی چوپال کی طرف سے درس گاہ اسلامی، دربھنگہ میں ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی ادبی خدمات پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر شاکر خلیق نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جلسے میں منصور خوشتر، حاجی اسعد، فیاض احمد وجیہہ، صفوان سلفی، جنید عالم، عبدالودود قاسمی، محمود بھارتی، ڈاکٹر شمیم، داؤد قاسمی، مجیر احمد آزاد اور ڈاکٹر امام اعظم نے ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس جلسے کی نظامت مجیر احمد آزاد نے کی۔ بعد ازاں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر عقیل صدیقی، ندا عارفی، منصور خوشتر، منور عالم راہی، امام الحق بیدار، ڈاکٹر محمود بھارتی، جنید عالم، عبدالودود قاسمی، عرشی مونگیری، حیدر وارثی، نور محمد عاجز، شمیم، پروفیسر شمیم باروی، فاروق اعظم انصاری، ڈاکٹر شاکر خلیق، کفیل احمد خاں، رہبر چندن پٹوی وغیرہ نے کلام پیش کیا۔

(ڈاک سے)

● مرادآباد، 21/اپریل۔ اتر پردیش میں اس وقت اردو کی ترقی کا نہیں بلکہ اردو کی بقا کا مسئلہ درپیش ہے۔ اس لیے اردو تعلیم کے شبینہ اسکول کھولنے اور ٹی وی کے ذریعے اردو تعلیم کے فروغ جیسے پروگرام زیرِ غور ہیں۔ اردو داں طبقے کو حکومت سے زیادہ توقعات وابستہ رکھنے کی بجائے اپنی ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔" ان خیالات کا اظہار اتر پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر یٰسین عثمانی نے فلاح القریش اسکول میں منعقدہ ایک جلسے میں کیا جو صحافی معصوم مرادآبادی کو یوپی اردو اکادمی کا انعام برائے صحافت ملنے کے سلسلے میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر معصوم مرادآبادی نے اردو کی بقا اور ترقی کے لیے ایک زبردست عوامی بیداری مہم چلانے کی ضرورت پر زور دیا۔ جلسے میں سابق میئر ہمایوں قدیر نے صدر شعبۂ اردو ہندو کالج ڈاکٹر عارف حسن خاں، صدر شعبۂ اردو ایم ایچ ڈگری کالج ڈاکٹر عباس رضا نیر، پروفیسر اے سعید، محمد شکیل قریشی، عبدالمجید شمسی، ڈاکٹر آصف حسین، ڈاکٹر راحت زماں خاں، قاسم مرادآبادی، حبیب الرحمان راشتی وغیرہ نے اظہارِ خیال کیا۔ (ڈاک سے)

● مالیر کوٹلہ۔ نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ آف پنجابی یونیورسٹی،

مالیر کوٹلہ میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت ادارے کے سربراہ پروفیسر زینت اللہ جاوید نے کی اور مہمان خصوصی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے جناب ظفر احمد تھے۔ جلسے میں ادارے کے ریسرچ اسکالر سلیم زبیری نے ''پنجاب میں اردو غزل کے پچاس سال (1951 تا 2000)'' کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ مقالے میں اردو ادب میں مختلف ادبی تحریکات کے پس منظر میں پنجاب میں اردو غزل کے پچاس برسوں پر محیط مختلف رجحانات و میلانات کا جائزہ لیتے ہوئے جدید ترین غزل کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جناب خالد کفایت اور ڈاکٹر محمد اقبال نے مقالے پر اظہار خیال کیا۔ جلسے کی نظامت ادارے کے ریڈر ڈاکٹر محمد جمیل نے کی۔ ڈاکٹر روبینہ شبنم نے شرکائے مجلس کا شکریہ ادا کیا۔

● مونگیر، 9 رمئی۔ رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر کے زیر اہتمام گیارہ طالبات کو دس دس ہزار روپے کے چیک سے نوازا گیا۔ چیک رحمانی فاؤنڈیشن کے چیئرمین نے تقسیم کیے۔ مولانا آزاد فاؤنڈیشن جو ملک کا ممتاز ادارہ ہے، کی طرف سے طلبہ و طالبات کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے وظیفے کے طور پر یہ رقم دی جاتی ہے۔ رحمانی فاؤنڈیشن کی کوشش اور جدوجہد سے مونگیر کی طالبات کو اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ مولانا آزاد فاؤنڈیشن اداروں کی ترقی، تعمیر، سامان کی خریداری کے لیے بڑے پیمانے پر امداد دیتا ہے اور طلبہ و طالبات کی مالی ہمت افزائی کرتا ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

● سیتاپور، ادبی تنظیم ''بزم اردو سیتاپور'' کی طرف سے ایک شعری محفل زیر صدارت مست حفیظ رحمانی منعقد ہوئی جس کی نظامت رضوان خاں، سکریٹری بزم اردو، سیتاپور نے کی۔ اس موقعے پر مہمانان خصوصی ڈاکٹر کمال اختر اور ای.ٹی.وی حیدرآباد کے نیوز ریڈر جناب فرحان الدین تھے۔ شعری نشست میں جن شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان میں جناب مست حفیظ رحمانی، ڈاکٹر کمال اختر، اشتیاق علی صبا، رضوان خاں، منظر یٰسین، شکیل ملا نوی، عمران سیتاپوری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (ڈاک سے)

● کرشنا گری، 26 راپریل۔ مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ کی طرف سے جناب اکبر پاشا قادری سابق جج، ہائی کورٹ کی صدارت میں یوم اردو منایا گیا۔ اس میں جناب مختار بدری کو تامل ناڈو گورنمنٹ اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کا ممبر نامزد ہونے پر انھیں مبارکباد پیش کی گئی۔ سید عثمان فہمی، ٹی ایچ مشتاق احمد، ڈاکٹر مسعود احمد، منیر رشیدی، ڈاکٹر سید شاہ صلاح الدین، فاروق احمد کونسلر وغیرہ نے ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر کرشنا گری میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دینے کا فیصلہ کیا گیا جو اردو اسکولوں کا معائنہ کرکے اساتذہ کے مسائل کو حل کرے اور اردو تحتانی مدارس کو مڈل اسکولوں اور مڈل اسکولوں کو ہائی اسکولوں میں تبدیل کرنے کے لیے مناسب اقدامات کرے۔ معتمد ٹرسٹ جناب احمد پاشا نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی، 6 رمئی۔ مولانا محمد علی جوہر اکادمی کے سرپرست اعلیٰ اور سابق صدر جمہوریہ ہند آنجہانی گیانی ذیل سنگھ کی یاد میں ان کے 89 ویں یوم ولادت پر غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ایک جلسہ کل ہند مشاعرہ زیر صدارت جناب مخمور سعیدی منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز ارشاد احمد نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ قاضی ابرار کرتپوری نے نعت پاک پیش کی۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر اختر الواسع، مودود صدیقی، منصور احمد عثمانی اور ضیاء اللہ عباسی فرسٹ سکریٹری پریس حکومت پاکستان نے شرکت کی۔ اکادمی کے جنرل سکریٹری ایم سلیم نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ بعد ازاں مہمانوں کے دست مبارک سے گیانی ذیل سنگھ ایوارڈ دیا گیا۔ اس موقعے پر ایک شعری نشست منعقد ہوئی جس کی نظامت گلزار دہلوی نے کی۔ پروگرام کے آخر میں واجد سحری نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ جن شعرا نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

رؤف رامش، واجد سحری، حیات لکھنوی، قیس رامپوری، سلیم صدیقی، مختار عثانی، مخمور سعیدی، نسیم دھامپوری، گلزار دہلوی، نصرت گوالیاری، پی پی سریواستو رند، طالب رامپوری، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی، منیر ہمدم، ڈاکٹر فریاد آزر، ابرار کرتپوری، شہباز ندیم ضیائی، متین امروہوی، انور باری، شمس رمزی اور صالحین فہمی۔ (ڈاک سے)

● کامٹی، 17 راپریل۔ شری سداشیوراؤ پاٹل، شکشن سنستھا کامٹی کی طرف سے کامٹی پالی ٹیکنک کالج میں ایک ہندو پاک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں پاکستان کے تین شعرا احمد فراز، مسلم شمیم اور ذکیہ غزل کے علاوہ ہندستانی شعرا میں معراج فیض آبادی، مدحت الاختر، تاجور سلطانہ، آفاق فاخری، شبنم خاں، احمد اشفاق، پاپولر میرٹھی، تنویر غازی، شیاما سنگھ صبا، لتا حیا، ریحان ناصر اور منور رانا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر جناب ساغر خیامی نے کی اور نظامت کی ذمے داری منور رانا نے نبھائی۔

مشاعرے سے قبل محمد حفظ الرحمٰن نے خیر مقدمی تقریر کی۔ ڈاکٹر بھوشن کمار اپادھیائے (ڈی آئی جی جیل) ناگپور اور نیاز احمد خاں پروگرام ایگزیکیٹو دوردرشن کا ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سند اور شال پیش کی گئی۔ شمیم فیضی، نیشنل سکریٹری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور ایڈیٹر اردو ماہنامہ ''حیات'' کو بھی اس موقعے پر میمنٹو اور شال پیش کیا گیا۔ مشاعرے میں جلیل ساز، جسٹس قاضی محمد مجیب الدین، امیر الدین ملک نے مہمانان اعزازی کے طور پر شرکت کی۔

(ڈاک سے)

رسمِ اجرا

سب ٹھیک ہے

● ممبئی۔ تخیل رائٹرس گروپ اور "گل بوٹے" کی جانب اردو کے معروف ڈراما نگار اور کالم نگار اقبال نیازی کے ڈراموں کے مجموعے "سب ٹھیک ہے" کی تقریبِ رونمائی کی صدارت مشہور ڈراما نگار اور اسکرپٹ رائٹر جاوید صدیقی نے کی اور مہمانِ خصوصی جناب نواب ملک (ایم ایل اے) تھے۔ کتاب کا اجرا جناب گلزار نے کیا۔ فاروق سید (مدیر "گل بوٹے") نے اقبال نیازی کا تعارف پیش کیا۔ اداکار عدنان سعید سرکھوت نے "میں! اقبال نیازی اور میرا ہمزاد" کے عنوان سے ایک ڈرامائی مونولاگ پیش کیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر قاسم امام نے کی۔ اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جناب گلزار نے کہا کہ "وہ حادثات جو ہم سب کو چھو کر گزر جاتے ہیں، اقبال صاحب نے ان لمحات، ان حادثات کو ڈراموں کی شکل دی ہے۔" گلزار صاحب نے لوگوں کے اصرار پر اپنی مشہور نظم "کتابیں" بھی سنائی۔ جناب نواب ملک نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ "اقبال نیازی ادب کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے کی خدمت پر بھی زور دیتے ہیں، اپنے سماج اور اپنی قوم کے تئیں ان کے دل میں جو درد ہے وہ ان کے ڈراموں میں نظر آتا ہے۔" جناب جاوید صدیقی نے "سب ٹھیک ہے!" کے حوالے سے کہا کہ "ان ڈراموں میں مجھے تین بڑی خوبیاں ملتی ہیں جو کسی بھی اچھے ڈراما نگار میں ہوتی ہیں۔ اوّل وہ اسٹیج کرافٹ سے پوری طرح واقف ہیں۔ دوم وہ بہت ہی رواں دواں خوبصورت زبان لکھتے ہیں۔ سوم وہ اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی حالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔" اس سے قبل سلام بن رزاق نے اپنے افتتاحیہ کلمات میں اقبال نیازی کے تھیٹر کے میدان میں پچیس سالہ سفر کا جائزہ لیا۔ اس موقعے پر جناب محمود ایوبی، جناب انور قمر، جناب مقدر حمید، پرنسپل سلمیٰ لوکھنڈوالا، محترمہ ریحانہ اندرے، اسلم خاں اور سعید احمد نے اپنی تقریروں میں اقبال نیازی سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا۔ آخر میں اقبال نیازی نے اپنے دوستوں، مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ڈرامائی سفر کی روداد بیان کرنے والی ایک نظم "مونولاگ" سنا کر اپنی دلی کیفیات کا اظہار کیا۔ آخر میں مظہر سلیم (مدیر "تخیل") نے بھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے) □□□

دیوان اشرف علی خاں فغاں

مرتب: سرور الہدیٰ

اشرف علی خاں فغاں اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا بچپن چونکہ دلی کے قلعۂ معلی میں گزر رہا تھا اس لیے ان کی زبان اور محاورے کو استناد کا درجہ حاصل ہے اور ان کے دیوان کا مطالعہ اردو کے محاورے، روزمرہ اور لب و لہجے کو سمجھنے میں معاون ہے۔ فغاں کے اردو اور فارسی کلام کا یہ تحقیقی ایڈیشن سرور الہدیٰ نے مرتب کیا ہے اور فغاں کے حالاتِ زندگی اور ان کے شاعرانہ اوصاف پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

صفحات: 285، قیمت -/123 روپے

مثنوی بہرام و گل اندام

شاعر: طبعی گولکنڈوی

بہرام اور گل اندام کا قصہ ان مقبول ترین قصوں میں ہے جنھیں فارسی اور اردو کے متعدد شاعروں نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب دکنی اردو میں ہے اور اس کا مصنف طبعی گولکنڈوی، آخری قطب شاہی حکمراں ابوالحسن تاناشاہ کا درباری شاعر ہے۔ طبعی نے اپنی مثنوی کی بنیاد امین الدین امین سبزواری کی فارسی مثنوی کو بنایا ہے۔ اردو کی جڑوں کی تلاش اور اس کے تہذیبی کردار سے آشنائی دکنی شعر و ادب سے شناسائی کے بغیر ممکن نہیں اور یہ مثنوی شعری محاسن سے بھی مالا مال ہے۔

صفحات: 236، قیمت: -/66 روپے

اردو مرثیے کا ارتقا (ابتدا سے انیس تک)

مصنف: ڈاکٹر مسیح الزماں

مرثیے نے اردو شاعری کو بڑی وسعت، تنوع اور وقار بخشا ہے اور تقریباً تین صدیوں کے سفر میں تہذیبی قدروں، ادبی تقاضوں اور مذہبی معتقدات کے زیرِ سایہ پرورش پا کر حیات و کائنات کے بہت سے پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کی یہ تحقیقی اور تنقیدی کتاب مرثیے کے آغاز سے اس کے ارتقائی سفر کے مختلف مدارج پر روشنی ڈالتی ہے اور اہم مرثیہ گو شاعروں کے فنی کارناموں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔

صفحات: 468، قیمت: -/136 روپے

سورداس کے روحانی نغمے

ترجمہ و ترتیب: جعفر رضا زیدی

سورداس ہندی کی عارفانہ شاعری کے بنیاد گزاروں میں ہیں لیکن ان کے ہاں تغزل کا رنگ اتنا حاوی ہے کہ عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کا فرق اپنے فاصلے ختم کر دیتا ہے۔ کرشن اور گوپیوں کے ہجر اور وصل کے مناظر اور کیفیات پیش کرنے میں سورداس اپنا جواب نہیں رکھتے۔ پروفیسر جعفر رضا زیدی (کملیش زیدی) نے "سور ساگر" سے ایک سو ایک نمائندہ پدوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ اس پر اصل کا گمان گزرتا ہے۔ کتاب دیوناگری اور اردو دونوں رسمِ خط میں ہے اور ترجمے کے ساتھ اصل متن بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 263، قیمت -/91 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تبصرہ وتعارف

پرواز/ ڈاکٹر اے. پی. جے عبدالکلام
معاون: ارون تیواری
مترجم: حبیب الرحمٰن چغتائی
صفحات: 201، قیمت: -/209 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: ظفر احمد نظامی

''پرواز'' موجودہ صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر اے. پی. جے عبدالکلام کی خودنوشت سوانح عمری ہے جسے ان کے رفیق کار ارون تیواری نے ان کی یادداشتوں کو مجتمع کر کے قلم بند کیا ہے۔ انگریزی میں کتاب کا نام Wings of Fire ہے۔ ارون تیواری نے اس کتاب کو قلم بند کرنے کے عمل کو ایک تیرتھ یاترا سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ اکثر لوگ ڈاکٹر کلام سے کبھی بالمشافہ ملاقات نہیں کر سکیں گے لیکن اس کتاب کے توسل سے وہ ان کی محبت کا لطف اٹھا سکیں گے اور وہ ان کے روحانی رفیق بن جائیں گے۔

ڈاکٹر کلام نے تامل ناڈو میں واقع رامیشورم نامی مقام پر ایک نیم خواندہ مذہبی خاندان میں 15/اکتوبر 1931 کو آنکھ کھولی۔ اسکول میں فیس جمع کرانے کی غرض سے املی کے بیج بیچے، اخبارات فروخت کیے اور اپنے بھائیوں کی دکان پر بیٹھ کر چیزیں بیچیں۔ یہاں تک کہ کالج کے زمانے میں معاشی مجبوریوں سے تنگ آکر خود کو سبزی خور بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

ان کے والد کا نام جین العابدین (زین العابدین) اور والدہ کا نام آشی اماں تھا۔ کلام پر ان کی مذہبیت کا خاصا اثر پڑا۔ ان کے والد انھیں مغرب کی نماز ادا کرنے کے لیے باقاعدگی سے مسجد لے جایا کرتے تھے اور والدہ رات کو سونے سے پہلے رسول اکرمؐ اور دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کی داستانیں سناتی تھیں۔ ان کے علاوہ ان پر ان کے عم زاد بھائی شمس الدین اور ہونے والے بہنوئی احمد جلال الدین نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ رامیشورم کے بعد انھوں نے رام ناتھ پورم سے ایم آئی ٹی مدراس میں داخلے کے لیے درخواست دے دی جس کے لیے ان کی بہن زہرہ نے اپنی سونے کی چوڑیاں رہن رکھ دیں تاکہ وہ کالج کی فیس ادا کر سکیں۔ بعد ازاں انھوں نے بنگلور جا کر ہندوستان ایروناٹکس لمیٹڈ میں تربیت حاصل کی۔ وہ ایرفورس میں ملازمت کرنا چاہتے تھے تاکہ ہوائی جہاز اڑا سکیں لیکن اس میں ناکامی کے بعد انھوں نے سینئر سائنٹفک اسسٹنٹ کی حیثیت سے وزارت دفاع کے ڈائریکٹوریٹ میں سول ایوی ایشن کے ٹیکنیکل سینٹر میں ڈھائی سو روپیہ ماہانہ تنخواہ سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ بعد میں جب ہوائی ترقیاتی ادارہ بنگلور میں قائم ہوگیا تو انھیں وہاں متعین کر دیا گیا۔ پھر ان کا تقرر انڈین کمیٹی فار اسپیس ریسرچ میں راکٹ انجینئر کی حیثیت سے ہوگیا۔ یہ ان کے خوابوں کی تعبیر کی سمت میں پہلا قدم تھا۔ جب 1962 میں تریویندرم (کیرالا) کے نزدیک تھمبا نامی مقام پر راکٹ لانچنگ اسٹیشن قائم کیا گیا اور ہندوستان میں جدید راکٹ سے متعلق تحقیق شروع کی گئی تو کلام نے وہیں اپنا دفتر قائم کر لیا۔

اسی اثنا میں کلام کو ساؤنڈنگ راکٹ لانچنگ ٹیکنکس کی چھ مہینوں کی تربیت حاصل کرنے کے لیے امریکہ جانا پڑا۔ وہاں انھیں ایسٹ کوسٹ کے ولوپس آئی لینڈ ورجینا میں ایک پینٹنگ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ خود ان ہی کے الفاظ میں ''یہ پینٹنگ انگریزوں سے برسرِ پیکار ٹیپو سلطان کی فوج کی ثابت ہوئی۔ اس میں ایک حقیقت کی تصویر کشی کی گئی تھی جو خود ٹیپو سلطان کے ملک میں تو بھلا دی گئی مگر اس سیارے کی دوسری طرف اسے یادگار بنا دیا گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ناسا نے ایک ہندوستانی کو راکٹ کی جنگ کا ہیرو بنا کر عزت بخشی۔''

بعد ازاں انھوں نے مختلف سائنسی اداروں میں اہم خدمات انجام دیں۔ ایک دفاعی سائنس داں کی حیثیت سے ان کے نمایاں کردار نے ان کے سر اگنی، پرتھوی، آکاش، ترشول اور ناگ جیسے میزائلوں کی اڑان کا سہرا باندھا۔ انھی کی بدولت ہندوستان عظمت کی اس بلندی سے ہمکنار ہوگیا کہ اب اس کا شمار بین الاقوامی میزائلی طاقت میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کلام نے حیرت انگیز طریقے سے اسلحہ سازی کے عمل میں ہندوستان کو ممتاز مقام دلایا جس کے لیے انھیں نہ صرف ہندوستان کے سب سے بڑے شہری اعزاز یعنی ''بھارت رتن'' سے نوازا گیا بلکہ صدر جمہوریہ کے اعلیٰ ترین منصب کے لیے بھی منتخب کیا گیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر کلام رقم طراز ہیں کہ ''میں بلاشبہ علم و فیضان کے لیے ہندوستانی سائنسدانوں کے ایک ممتاز سلسلۂ نسب کا رہین منت ہوں جس میں وکرم سارا بھائی، ستیش دھون اور پریم پرکاش شامل ہیں۔ انھوں نے نہ صرف میری زندگی بلکہ ہندوستانی سائنس کی داستان میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔''

اس کتاب کے بارے میں خود ڈاکٹر کلام نے لکھا ہے کہ ''مجھے امید ہے کہ یہ کہانی صرف میری کامرانیوں اور آزمائشوں ہی کی روداد نہیں ہے بلکہ جدید

ہندوستان میں سائنس کے قیام کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی تفصیل بھی ہے۔ یہ قومی فیضان اور مشترکہ کوشش کی داستان ہے۔ میں اسے اپنے وقتوں کی ایک حکایت سمجھتا ہوں جو سائنسی خود کفالت اور ٹیکنالوجیائی استعداد کے لیے ہندوستان کے کارناموں پر مبنی ہے۔''

کتاب کے ابتدائی صفحات میں ڈاکٹر کلام نے اپنے ہم وطنوں کو پیغام دیتے ہوئے لکھا ہے کہ'' اللہ نے ہر ایک مخلوق کو اس حسین سیارے پر ایک خاص کردار ادا کرنے کی غرض سے پیدا کیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں جو کچھ حاصل کیا اس میں پروردگار کی مدد شامل حال رہی ہے اور یہ اسی کی مرضی کا اظہار ہے۔۔۔ یہ تمام راکٹ اور میزائل اسی کا کام ہے جو کلام جیسے ایک ادنیٰ انسان کے ذریعے پورے ہوئے تاکہ ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کو بتایا جاسکے کہ وہ خود کو حقیر و مجبور نہ سمجھیں۔ ہم سب اپنے سینوں میں ایک الوہی آگ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ اس آگ کو بال و پر عطا کردیں اور دنیا کو اس کی فضیلت کے نور سے منور کردیں۔''

کتاب کا ترجمہ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کے سابق ڈائرکٹر حبیب الرحمن چغانی نے کیا ہے جنھیں ترجمے کے فن پر مہارت حاصل ہے۔ بعض مقامات پر ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے ''پرواز'' کی اشاعت کو عملی جامہ پہنایا۔

•

مرزا غالب ایک سوانحی منظرنامہ/گلزار

صفحات:236، قیمت:-/395روپے

ناشر:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-66

مبصر:قمر رئیس

خطِ گلزار یوں تو اردو اور فارسی کا ایک آرائشی خط ہے جس میں خطاط اپنے دستِ ہنر سے جادو بکھیرتا ہے لیکن یہاں خطِ گلزار سے مراد تحریر و تمثیل نگاری کا وہ اسلوب ہے جس کے سہارے گلزار نے مرزا غالب کو ایک حیاتِ نو بخشی ہے۔ کم و بیش نصف صدی پہلے بڑے پردے پر یہی کام سہراب مودی نے انجام دیا تھا وہاں غالب کی پیکر آفرینی میں کلاسیکی سوچ اور ڈرامائیت غالب تھی جبکہ گلزار کے سیریل میں ایک جدید اور نسبتاً آزاد ذہن نے مرزا غالب کو عہدِ حاضر کے زیادہ خوش ذوق اور کھلے ذہن کے مالک ناظرین سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ گلزار کی یہ روشن خیالی نہ صرف ان کی فلموں میں بلکہ ان کی نظموں اور کہانیوں میں بھی جھلکتی ہے۔ مرزا غالب کی زندگی، آزاد مشربی، ان کا فکری سفر اور شاعری اور نثر نگاری، ہماری تہذیب کا ایسا سرمایہ ہے کہ جس کی دید و دریافت ہر عہد میں ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی اور اس کے لیے اب صرف تحقیق و تنقید ہی نہیں بلکہ ٹی.وی.، ویڈیو اور دوسرے ان گنت جدید وسائل سے بھی، موثر ڈھنگ سے کام لیا جارہا ہے۔ اس کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ اوّل مرزا غالب کے تخلیقی کارناموں سے گہری واقفیت اور محبت اور دوسرے پردے پر ایک بڑے تخلیق کار کی تعبیر و ترجمانی کی غیر معمولی صلاحیت اور یہ دونوں صفات گلزار میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس پر مستزاد اردو زبان اور اس کی تہذیب پر قدرت کے ساتھ ساتھ پیش کش کی جدید تکنیک سے واقفیت جس سے گلزار کی شناسائی ماہرانہ حیثیت رکھتی ہے۔

فلم یا سیریل کا بنیادی دستاویز اس کا منظرنامہ ہی ہوتا ہے۔ غالب سے منسوب مذکورہ سیریل کے لیے گلزار نے جو منظرنامہ لکھا تھا ظاہر ہے وہ تحقیق اور مطالعے کے بغیر کوئی اعتبار نہیں پاسکتا تھا۔ اس سے بھی اہم ہوتی ہے اس کی ایسی ڈرامائی پیشکش جو دلچسپ، معنی خیز اور تحیر زا ہونے کے ساتھ ساتھ موضوع کو عہد حاضر کی حسیت اور تقاضوں سے ہم آہنگ بنا سکے۔ منظرنامہ نگار کی بڑی آزمائش اسی میں ہوتی ہے۔ گلزار نے اس سینیریو میں (جو مطبوعہ صورت میں ہمارے سامنے ہے) مرزا غالب کی کثیر الجہت شخصیت کے جو خال و خط ابھارے ہیں وہ بلاشبہ اسے قومی تہذیب اور اس کی تخلیقی دانش و فکر کے افق پر ایک درخشاں ستارے کی صورت سامنے لاتے ہیں۔ یہی نہیں وہ اس کی منفرد شخصیت اور شاعرانہ عظمت کے کچھ ایسے نقوش بھی اجاگر کرتے ہیں جو عصری معنویت کے حامل ہیں اور جو تحقیق اور تنقید کی دستاویزوں میں کچھ دھندلے اور بے جان سے تھے۔ منظرنامہ سترہ ابواب کو محیط ہے لیکن پہلے ہی منظر میں غالب کا تعارف ستر سال کے ایک ایسے بوڑھے کے روپ میں ہوتا ہے جس کے وجود میں نوعمری کی ساری آرزومندیاں اور امنگیں سانس لے رہی ہیں۔ وہیں آزاد خیالی، شوخیِ فکر اور دنیا کو ایک تماشہ گاہ سمجھنے کا انداز غالب کے ہر قول و عمل سے مترشح ہوتا ہے۔ دہلی کی زوال پذیر تہذیب اور نئے نو آبادیاتی نظام کی بڑھتی گرفت اور مغلیہ عہد کے نظامِ کہنہ سے تو غالب پہلے ہی بیزار تھے، گلی قاسم جان میں ایک نوجوان کے ہاتھ میں کبوتر دیکھ کر کچھ تلخی سے کہتے ہیں۔ ''دیکھو میاں! شکایت ہم سے نہیں خود سے کرو۔ قومیں بادشاہوں سے نہیں عوام سے بنتی ہیں۔ اور آپ اگر آج بھی کبوتر نہ اڑا رہے ہوتے تو یہ ملک کچھ اور ہوتا، یہ قوم کچھ اور ہوتی۔۔ جاؤ کبوتر اڑاؤ۔'' غالب جانتے تھے کہ مغلیہ عہد کے جاہ و جلال کے بعد زوال کیسے آیا؟ غالب کی آزاد مشربی انگریز کی غلامی پر رضامند نہیں تھی لیکن نو آبادیاتی نظام میں جمہوری آزادی، انسانی حقوق، امن و انصاف، شہری سہولتوں اور قومی وحدت کے جو تصورات سامنے آئے وہ خام سہی لیکن غالب انسانیت کی بقا کے لیے انھیں مفید سمجھ کر نشان زد کرتے ہیں۔ پھر ان کا اپنا انسانی کردار، سیکولر مزاج، مشترکہ

تہذیبی قدروں پر اعتماد عام انسانوں سے پہچان کا جذبہ، دوستوں، شاگردوں اور اہلِ خانہ سے محبت، اخلاق اور دردمندی کا رشتہ، اس سے بھی آگے ان کی ذاتی زندگی کی محرومیاں، تشنہ کامیاں، عاشقی، قرضداری رسوائیاں اور اس عہد آشوب میں جینے کی تگ و دو۔ گلزار کے اس سیریل کو جن لوگوں نے دیکھا ہے انھیں یاد ہوگا کہ ان تمام پہلوؤں کو غالب کے متحرک کردار میں بڑی ہنرمندی سے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہاں غالب کے کردار کی مرقع کشی میں ظاہر ہے کہ موسیقی، تصویر کشی، لباس اور دوسرے تکنیکی کمالات کا اثر بھی رہا ہوگا۔ جبکہ اس منظرنامے میں گلزار کے فن قصہ نگاری اور شاعرانہ تخیل کے ساتھ منظر کے بیان، مکالمات اور اشعار سے ہی کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس سلیقے سے کہ شاعر کی پہلودار شخصیت اور تخلیقی کارناموں کے کم و بیش تمام رنگ ابھر آئے ہیں۔

اس منظرنامے کی اہمیت کے دوسرے کئی پہلو بھی ہیں۔ یہ اس حقیقت کو مستحکم کرتا ہے کہ فلم ہو یا سیریل یہ اردو زبان ہی ہے جو آج بھی ملک میں ہمہ گیر اپیل اور مقبولیت رکھتی ہے، ہر علاقے اور ہر طبقے میں سمجھی جاتی ہے۔ ورنہ تجارتی مقاصد کو لے کر کروڑوں ناظرین کے لیے فلم یا سیریل بنانے والے اس زبان کا یا اس سے لسانی اور تہذیبی قربت رکھنے والی عام فہم زبان کا استعمال نہ کرتے۔ اس نوع کے کامیاب منظرناموں کی اشاعت سے اس زبان میں مکالمے اور منظر لکھنے کی ترغیب ملتی ہے اور اس طرح اردو کی مقبولیت میں کچھ اضافہ ہی ہوتا ہے۔ آخر میں یہ کہ اختر الایمان، راجندر سنگھ بیدی اور دوسرے ممتاز اردو ادیبوں نے فلموں یا سیریل کے جو منظرنامے لکھے ہیں وہ کتابی شکل میں شائع ہو کر سامنے نہیں آئے۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے بے شمار نوجوان بے روزگاری کا شکار ہیں۔ گلزار کا یہ منظرنامہ یا دوسرے منظرناموں کے مسودے جو حال میں شائع ہوئے ہیں، اردو کے نوعمر ادیبوں کے لیے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس میدان میں ان کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

●

وائرس کا شکنجہ / ایرا سکسینہ
صفحات: 136، قیمت: -/30 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: ایس. اے. رحمٰن

آج کمپیوٹر ہماری زندگی کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔ دیکھا جائے تو کمپیوٹر انسانی دماغ کا کام کرتا ہے جبکہ خود کمپیوٹر کی ایجاد انسان کی دماغی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے۔ ہوائی جہاز اور ٹیلی فون کی ایجادوں نے دنیا کے فاصلوں کو مختصر کر دیا تھا لیکن کمپیوٹر کی ایجاد نے تو فاصلوں کو ختم ہی کر دیا ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں لمحوں میں رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے اور آپسی گفتگو سے مسائل بھی حل کیے جا سکتے ہیں۔ کمپیوٹر سے نکالے گئے خطوں پر دستخط کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ان کا متن کمپیوٹر میں محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ جس طرح انسان کے ساتھ دکھ تکلیف، مسئلے مسائل لگے رہتے ہیں، اسی طرح اس کے استعمال کے کارآمد وسیلوں پر بھی افتاد پڑتی ہے۔ کبھی ٹیلی فون خراب ہوتا ہے تو کبھی مشین چلتے چلتے بند ہو جاتی ہے۔ بجلی انسانی زندگی میں متعدد سہولتیں فراہم کرنے کی اساس ہے۔ اس کی فراہمی رک جاتی ہے تو لگتا ہے کہ زندگی چلتے چلتے ٹھہر گئی ہے۔ فرج بند ہو جاتا ہے، مکسی کام نہیں کرتی، موٹر پانی نہیں چڑھاتا بلکہ پانی کی سپلائی ہی بند ہو جاتی ہے، انٹرکام کام نہیں کرتا، گیزر میں پانی گرم نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ متعدد مسئلے سامنے آ جاتے ہیں۔ کمپیوٹر بھی بجلی کی اساس پر کام کرتا ہے۔ کمپیوٹر میں پروگرام محفوظ کیے جا سکتے ہیں اور حسب ضرورت انھیں ڈاؤن لوڈ بھی کیا جا سکتا ہے۔ نشر و اشاعت، اشتہارات، کتابوں رسالوں کے لیے سرورق، متن کی کمپوزنگ کے لیے کمپیوٹر وسیلہ ہے تو بچوں کے لیے کمپیوٹر کھیل بھی مقبول ہیں۔

کمپیوٹر میں دوسری مشینوں کی طرح کوئی بھی تکنیکی خرابی کبھی بھی پیدا ہو سکتی ہے لیکن ایک نیا مسئلہ جس نے کمپیوٹر کی کارکردگی کو متاثر کیا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے انسانی دماغ میں فتور آ جانا۔ یہ وائرس کا مسئلہ ہے جس سے کمپیوٹر کی معتبر کارکردگی متاثر ہونے لگی ہے۔ وائرس کے مسئلے پر زیر تبصرہ کتاب خاص طور سے بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کا اصل انگریزی ایڈیشن 1998 میں چلڈرن بک ٹرسٹ نے شائع کیا تھا۔ اسی کتاب کا یہ اردو ترجمہ قومی اردو کونسل نے شائع کیا ہے۔ کتاب دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ ترجمہ رواں اور اسلوب متاثر کن ہے جس کے لیے مترجم کی محنت اور مہارت قابلِ تعریف ہے۔ وائرس، کمپیوٹر پروگراموں کے لیے شکنجہ بنتا جا رہا ہے۔ ذرا سی لاپرواہی سے کوئی بھی پروگرام ضائع ہو سکتا ہے۔ وائرس کے اس دخل کو مصنفہ نے مہارت سے کہانی کے روپ میں ڈھالا ہے اور کمپیوٹر سے متعلقہ مسائل کی وضاحت اسی طرح کی ہے کہ بچے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور سمجھائے گئے حلوں کے مطابق اپنے کمپیوٹر پروگراموں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ انشومن، چانس، گائتری، ٹی ٹی سیر، روہت گپتا، دیپک، شرما جی وغیرہ کرداروں کے گرد کہانی کا تانا بانا بڑی مہارت سے بنا گیا ہے اور کہانی اس طرح پیش کی گئی ہے کہ معلوماتی مواد قاری کی دلچسپی کو کم نہیں کرتا۔ لیزر کمپوزنگ میں صاف ستھری چھپنے والی اس کتاب کا سرورق بھی موضوع کی نمائندگی کرتا ہے۔ کتاب میں موضوع سے متعلق چند تصویریں بھی ہیں۔

●

موج نقد/مرزا محمد زماں آزردہ

صفحات:254، قیمت:250روپے
ناشر:مرزا پبلی کیشنز، سری نگر، کشمیر
مبصر:کلیم اللہ

آج کل تنقیدی مضامین کے مجموعے بہ کثرت شائع ہو رہے ہیں لیکن ان میں چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو صاحب ذوق قاری کی توجہ حاصل کر سکیں۔ ایسی ہی ایک کتاب مرزا محمد زماں آزردہ کی ''موج نقد'' ہے جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں کل پندرہ مضامین ہیں جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے صاحب کتاب کی تنقیدی بصیرت سے آگاہی ہوتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں کچھ موضوعات تو ایسے ہیں جن پر اردو کا ہر پڑھا لکھا شخص اپنی رائے کا اظہار کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتا ہے۔ لیکن کچھ ایسے مضامین بھی ہیں جن پر قلم اٹھانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ جیسے ادبی ترجمہ ــــ مسائل اور حل، صنف انشائیہ، مرزا دبیر کی اردو نثر اور فصیح کی مجلس ماتم، شیخ العالم کا تصور عشق اور اردو اور کشمیری رسم خط اور املا۔ مرزا محمد زماں آزردہ نے اپنی صاف ستھری اور رواں دواں نثر میں ان موضوعات پر تنقیدی مضامین لکھ کر قارئین کو اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ''ادبی ترجمہ ــــ مسائل اور حل'' اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ فی زمانہ مختلف زبانوں سے جو تراجم ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں ان کے مترجمین کو کیا کیا دقتیں اور دشواریاں پیش آتی ہیں، مضمون میں ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور ان کے حل کی کیا سبیل ہو سکتی ہے اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ صنف انشائیہ پر کئی کتابیں اور مضامین موجود ہیں لیکن مرزا محمد زماں آزردہ نے مغربی اور مشرقی ادبیات کے حوالے سے اس صنف ادب کی ابتدا سے لے کر اس کے ایک آزاد صنف ادب کی حیثیت اختیار کرنے تک کا احوال مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ مرزا دبیر کی شاعری آزردہ صاحب کا خصوصی موضوع ہے اور اس ضمن میں ان کی مشہور کتاب ''مرزا سلامت علی دبیر: حیات و کارنامے'' ایک مستند حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ آزردہ صاحب کو اردو اور کشمیری دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے اسی لیے وہ ''شیخ العالم کا تصور عشق'' اور ''اردو اور کشمیری رسم خط اور املا'' پر پُر مغز مضامین لکھنے میں کامیاب ہوئے۔

پروفیسر زماں آزردہ نے مرزا اسد اللہ خاں غالب، مرزا سلامت علی دبیر، پنڈت برج نارائن چکبست، پریم چند، محمد اقبال، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، مسعود حسین رضوی ادیب جیسی اہم ادبی شخصیات کے فکر و فن کو بطور خاص موضوع گفتگو بنایا ہے ساتھ ہی ساتھ ان کے انفرادی خد و خال ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

تنقیدی مضامین کی یہ کتاب نہ صرف قاری کی ادبی معلومات میں اضافے کا موجب ہوگی بلکہ وہ آزردہ صاحب کے اس مخصوص طرز تحریر سے بھی لطف اندوز ہوگا جو سنجیدگی اور شگفتگی کے امتزاج سے عبارت ہے۔

•

کرناٹک میں اردو صحافت/ڈاکٹر انیس صدیقی

صفحات:260، قیمت:200روپے
ناشر: افلاک پبلی کیشنز، وہائٹ ہاؤس، نیو ہینک کالونی، بلال آباد، گلبرگہ-4
مبصر:امجد جاوید

پچھلے دنوں کچھ اچھے تحقیقی مقالے منظر عام پر آئے ہیں جن میں انیس صدیقی کا زیر نظر مقالہ ''کرناٹک میں اردو صحافت'' بھی شامل ہے۔ پہلے بھی اس موضوع پر گاہ بہ گاہ مضامین شائع ہوتے رہے ہیں لیکن کوئی باقاعدہ تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔ قدیم اخبارات و رسائل کی فائلیں اور ان سے متعلق مواد کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ انیس صدیقی نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ ''اردو صحافت کے سرمائے کا جائزہ لیا جائے تو شدید محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اخبارات و رسائل کے حسن کو ایک حباب کے مانند تصور کیا گیا۔ خریدا، پڑھا اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ نتیجتاً آج نہ صرف کتب خانے صحافتی ذخائر سے محروم ہیں بلکہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ مالکان اور مدیران کے پاس بھی اخبارات و رسائل کی فائلیں موجود نہیں ہیں۔''

صحافت کی تحقیق کی انھی دشواریوں کے پیش نظر شاید پیش رو محققین نے اس موضوع کو بھاری پتھر سمجھا اور چوم کر آگے نکل گئے، لیکن انیس صدیقی نے بڑی محنت، لگن اور جستجو سے اس کام کو سرانجام دیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب جملہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ہے ''کرناٹک کے اردو روزنامے''۔ باب کے آغاز میں انیس صدیقی نے کرناٹک کے تمام اہم اردو روزناموں کا اختصار کے ساتھ احاطہ کیا ہے پھر ریاست کرناٹک کے اولین روزنامہ ''الکلام'' بنگلور (مدیر۔ کلیم الملک سید غوث محی الدین) سے لے کر روزنامہ ''سرخ زمین'' بیدر (مدیر۔ قاضی ارشد علی) تک چوبیس روزناموں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

دوسرا باب ''کرناٹک کے اردو ہفت روزہ اخبار: توضیحات'' ہے۔ اس باب میں بتیس ہفت روزہ اخباروں پر بہت جامع انداز میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ریاست کا اولین ہفت روزہ اخبار ''قاسم الاخبار'' (مدیر۔ محمد قاسم) تھا۔ اس کے علاوہ ''طلسم کرناٹک'' بنگلور (مدیر۔ قادر باشاہ قادر) سے لے کر ''صدف'' بنگلور (مدیر۔ خالد انجم) تک ریاست کے ہفت روزہ اخباروں کے بارے میں وہ

تمام تفصیلات بیان کی گئی ہیں جو ضروری تھیں۔

تیسرا باب کرناٹک کے اردو رسائل و جرائد سے متعلق ہے، جس میں ریاست کے اولین رسالے "محافظ" بنگلور (مدیر۔ محمد عبد المجیب) سے لے کر "انوار جلالیہ" گوگی، گلبرگہ (مدیر۔ سید محمد یوسف حسینی) تک اکیاون (51) اردو رسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کے مطالعے سے ریاست کے اہم ادبی، سیاسی، مذہبی اور فلمی رسائل کی صورت حال، ان کے مزاج، فکر اور رجحان کا بھر پور اندازہ ہوتا ہے۔

"کرناٹک کے اہم صحافی" کے زیر عنوان چوتھے باب میں کرناٹک کے چوبیس اہم اردو صحافیوں کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب کے آغاز میں ممتاز صحافیوں کے حوالوں سے 'صحافی' کی تعریف اور اس کے مناصب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ صحافیوں کے انتخاب کے علاوہ ان پر لکھتے ہوئے بھی انیس صدیقی نے بڑی احتیاط اور غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔

اس کتاب کے پہلے، دوسرے اور تیسرے باب کے آخر میں ان اخبارات و رسائل کی فہرستیں شامل کی گئی ہیں جن کا مواد باوجود تلاشِ بسیار کے حاصل نہ ہو سکا یا پھر جنھوں نے جنم لیتے ہی دم توڑ دیا تھا۔ اس طرح کی فہرستوں کی اشاعت، آنے والے محققین کے لیے رہبری کا کام کرتی ہے۔ مزید برآں ہر باب کے آخر میں اخبارات و رسائل کے عکس کی شمولیت، تحقیق کو استناد کا درجہ عطا کرتی ہے۔

کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر طیب انصاری نے لکھا ہے۔ "حرف اخلاص" حامد اکمل کے مضمون کا عنوان ہے۔

"اک سخن اور" کے تحت جواں سال شاعر اکرم نقاش نے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے جامعات میں ہونے والی تحقیق کی زبوں حالی پر بڑی صاف گوئی اور دردمندی سے اظہار خیال کیا ہے۔ انیس صدیقی کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ "انیس صدیقی حد درجہ کم آمیز، کم سخن اور محتاط و متوازن شخصیت کے مالک ہیں۔ مقالے کے نتائج قائم کرنے میں انھوں نے اسی احتیاط و توازن سے کام لیا ہے لیکن مقالے کے مواد کے حصول میں جس شوق و جنون اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اس کی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔"

اس کتاب میں بہت ممکن ہے کچھ اخبارات و رسائل کے علاوہ صحافیوں کا ذکر بھی شامل ہونے سے رہ گیا ہو لیکن انیس صدیقی نے ابتدا ہی میں اس کی صراحت کردی ہے کہ مستقبل میں اس موضوع پر مزید تحقیق ہوگی اور نئے حقائق سامنے آئیں گے۔ البتہ اس کتاب کی اہمیت برقرار رہے گی۔

کتابت و طباعت معیاری ہے۔ امید ہے یہ کتاب قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگی۔

□□□

تنقیدی افکار

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1983 میں چھپا تھا۔ 1986 میں اسے ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا۔ اس میں نظری تنقید، نظریۂ نقد اور مشرق و مغرب کی شعریات کے حوالے سے اہم مضامین شامل ہیں۔ تین نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ کونسل نے اس اہم کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 348، قیمت: -/148 روپے

عروض، آہنگ اور بیان

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے عہد کے معتبر ترین علمائے ادب میں ہیں۔ اس کتاب میں ان کے دس اہم مضامین شامل ہیں جن میں شاعری کے محاسن و معائب کے مروجہ پیمانوں کے جواز اور عدم جواز پر مدلل گفتگو کی گئی ہے ــــ اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر تین نئے مضامین کے اضافوں کے ساتھ اردو کونسل نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

صفحات: 340، قیمت: -/144 روپے

کلیات آغا حشر کاشمیری

مرتبین: آغا جمیل کاشمیری اور یعقوب یاور

آغا حشر اردو کے پہلے ڈراما نگار ہیں جن کے ڈراموں کو ملک بھر میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے ڈراموں کی اسی غیر معمولی مقبولیت کی بنا پر انھیں انڈین شیکسپیئر بھی کہا گیا ــــ ان کے تمام ڈراموں کا مستند متن جناب آغا جمیل کاشمیری اور جناب یعقوب یاور نے بڑی محنت سے اردو کونسل کے لیے مرتب کیا ہے جو آٹھ ضخیم جلدوں میں شائع ہوگا۔ تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

صفحات (تینوں جلدیں): 1202، قیمت: -/460 روپے

اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

مصنف: پروفیسر حنیف کیفی

نظم معرّا اور آزاد نظم کے موضوع پر یہ کتاب دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔ مصنف نے اپنی شعری روایت کو نظر میں رکھتے ہوئے مغرب میں ان اصناف کے ارتقا کا جائزہ لیا ہے اور مستند نقادوں نے ان کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، ان کے حوالے سے اپنی گفتگو کو وسیع بنایا ہے۔

صفحات: 608، قیمت: -/182 روپے

نوٹ: طلبه اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

شمیم احمد بچوں کا گوشہ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں کونسل کی شائع کردہ کتاب "نورتن کہانیاں" سے ایک کہانی پیش کی جارہی ہے۔

اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت بے حد دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں دی گئی ہیں۔ چند عنوانات مندرجۂ ذیل ہیں۔ عقل مندوں کی کہانیاں، فریاد ہوں اور عادلوں کی کہانیاں، بے وقوفوں کی کہانیاں، ظریفوں کی کہانیاں، افیونیوں کی کہانیاں، کنجوسوں کی کہانیاں۔ 192 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 23روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد خصوصی رعایت دیتی ہے۔

بزدل شیر

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک شیر تھا، جو کسی جنگل میں رہتا اور وہاں راج کرتا تھا۔ اسی جنگل میں ایک بندر بھی رہتا تھا، جو شیر کے گھر کی ہر وقت نگرانی کرتا رہتا تھا۔ بہت دن تک ایک ہی جگہ رہتے رہتے شیر اکتا گیا تو اس نے سوچا کہ چلو کچھ دن کہیں گھوم پھر آئیں۔ اس نے اپنے گھر کی دیکھ بھال بندر کو سونپی اور سیر سپاٹے کے لیے کہیں چلا گیا۔ ایک دو روز کے بعد ادھر سے ایک سیاہ گوش کا گزر ہوا۔ اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے بھی تھے۔ سیاہ گوش کو شیر کا گھر بہت پسند آیا۔ اس نے خوش ہو کر اپنی بیوی سے کہا۔

"اری نیک بخت! دیکھ تو سہی، ایسا سندر بن تو ہم نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ شعر

آؤ اس جا پہ بودوباش کریں
اور گھر کس لیے تلاش کریں

یہ بات کہہ کر سیاہ گوش نے بیوی بچوں سمیت شیر کے گھر میں ڈیرا جما دیا۔ یہ دیکھ کر چوکیدار بندر نے کہا۔

"اے سیاہ گوش! کیا تیری عقل ماری گئی ہے۔ دیکھتا نہیں کہ یہ گھر جنگل کے مہاراجہ کا ہے۔ فوراً یہاں سے چلتا بن نہیں تو اے بے وقوف! تو خواہ مخواہ موت کے پنجے میں گرفتار ہو جائے گا۔"

بندر کے منہ سے یہ کڑوی بات سن کر سیاہ گوش بولا۔

"ارے جا بندر مچھندر! کیا بکواس کر رہا ہے۔ آج سے نہیں، یہ جگہ ہمارے باپ دادا کے زمانے سے ہماری رہی ہے۔"

نڈر سیاہ گوش کا یہ جواب سن کر میاں بندر نے دل میں سوچا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیاہ گوش ضرور کوئی بلا ہے، جبھی تو اس طرح اکڑ کر بات کر رہا ہے، ورنہ شیر کا نام تو ایسا ہے کہ سنتے ہی انسان اور حیوان سب کا پتا پانی ہوتا ہے۔" بندر تو یہ سوچ کر چپ ہو رہا، اور چپ

چاپ وہاں سے کھسک گیا، لیکن سیاہ گوش کی بیوی نے کہا۔

''یہ گھر جنگل کے شیر راجہ کا ہے، بہتر یہی ہے کہ یہاں سے اٹھ چلیں، کسی اور جگہ جا کر بے فکری سے رہیں، بے فائدہ خطرہ مول لینے سے کیا حاصل۔''

اپنی بیوی کی یہ بات سن کر سیاہ گوش بولا۔

''اے بی بی تو گھبراتی کیوں ہے؟ میں نے کوئی کچی گولیاں تو کھیلی نہیں۔ جب شیر یہاں آئے گا تو میں وہ کرتب دکھاؤں گا کہ وہ یہاں سے دُم دبا کر بھاگ جائے گا۔ اس کی بیوی یہ سن کر حیران ہوئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''میاں جی! کہیں تمھارے ساتھ بھی گیدڑ اور بھیڑیے کا سا معاملہ نہ ہو جائے۔''

سیاہ گوش نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''اے بی بی! وہ گیدڑ اور بھیڑیے کا کیا معاملہ ہے؟''

سیاہ گوش کی بیوی نے جواب دیا۔

''میاں جی! جو میں کہتی ہوں، دھیان سے سنو اور اس قصے سے سبق لو۔''

گیدڑ اور بھیڑیے کا قصہ:

کہتے ہیں ایک بار ایک بھیڑیا کسی گیدڑ کا شکار کرنے کو اس کے پیچھے لپکا لیکن خوش قسمتی سے گیدڑ اس کے ہاتھ نہ آیا اور بھاگ گیا۔ اب تو بھیڑیے کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے اپنے دل میں یہ ترکیب سوچی کہ چپکے سے گیدڑ کے گھر میں گھس کر بیٹھ جانا چاہیے۔ آخر جائے گا کہاں؟ ہر پھر کر آئے گا تو اپنے گھر ہی میں، تب لپک کر اس کی گردن دبوچ لوں گا اور خوب مزے لے لے کر اس کا گوشت کھاؤں گا۔ بھیڑیا اپنی اس ترکیب پر بڑا خوش ہوا اور دبے پاؤں گیدڑ کے گھر میں جا چھپا۔ دوپہر میں گیدڑ بے فکری سے ٹہلتا ہوا اپنے گھر کی طرف آیا، وہ اندر گھسنا ہی چاہتا تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گھر کے دروازے پر انجان پاؤں کے نشان ہیں۔ یہ نئی بات تھی۔ اسے خطرے کا احساس ہو گیا اور وہ دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رہ گیا

اور دل میں لگا یہ کہنے بات
گھر میں بیٹھا ہے اب کوئی بد ذات
کیجیے اس سے ایسی اب حرفت
جس میں اس کی چلے نہ اک فطرت

گیدڑ کو اب ایک نرالی ترکیب سوجھی۔ اس نے آواز لگائی۔

''اے میرے بے در گھر! میں بے خبر اس وقت تجھ میں آؤں یا نہیں؟''

گھر کے اندر بیٹھے ہوئے بھیڑیے کو گیدڑ کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی، پر وہ جواب میں کچھ نہ بولا، چپکا بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد گیدڑ نے پھر ہانک لگائی۔

''کیوں میرے بے در گھر! میں بے خبر آؤں یا نہ آؤں؟ کیونکہ میرے اور تیرے درمیان سوال و جواب کی یہ رسم پرانی ہے۔ یوں کہ پتھر کی بنیاد مٹی سے ہے اور پہاڑ کی بنیاد پتھر پر قائم ہے اور تو جانتا ہے کہ پہاڑ کی رسم سوال و جواب کی ہے، یعنی جب کوئی پہاڑ تلے سے آواز دیتا ہے تو پہاڑ بھی پیاری آواز میں اس کا جواب دیتا ہے۔ سو اب تو جواب دے کر میں تیرے اندر آؤں یا نہ آؤں؟''

گیدڑ کی یہ باتیں سن کر بھیڑیا دل میں سوچنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس گیدڑ کے گھر کی یہی رسم ہے کہ جب یہ گھر آنے کو کہتا ہے تو آنے والا آتا ہے، نہیں تو نہیں آتا۔ اگر اب کی بار وہ اس گھر سے آواز نہ سنے گا تو ہرگز نہیں آئے گا اور میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ یہ بدذات گیدڑ اب جو آواز دے تو میں فوراً جواب دوں۔ میاں بھیڑیے دل میں یہ بات سوچ کر تیار بیٹھے ہی تھے کہ گیدڑ نے پھر آواز دی۔

''اے میرے گھر! آج تو مجھ کو جواب کیوں نہیں دیتا ہے؟'' بھیڑیے نے گیدڑ کی آواز سنتے ہی جھٹ جواب دیا۔

''آجا بھائی! میں تیرا ہی گھر ہوں۔ بے دھڑک چلا آ۔''

گیدڑ نے جو اپنے گھر کے اندر سے اُس بھیڑیے کی آواز سنی تو ناچتا گاتا بھاگ کر اُس چرواہے کے پاس جا پہنچا جو اس بھیڑیے کا جانی دشمن تھا۔ چرواہا بھیڑیے کا اتہ پتہ معلوم کر کے جھولی میں بہت سارے پتھر ڈال کر سیدھا وہاں آیا اور گیدڑ کے گھر پر بے تحاشا پتھر برسانے لگا۔ آخر کار پتھروں کی مار کھاتے کھاتے بھیڑیا مر گیا۔''

یہ قصہ سنا کر سیاہ گوش کی بیوی نے کہا۔

''تو اے میاں جی! مجھے ڈر ہے کہ تو جو اس بھیڑیے کی سی حرکت کر رہا ہے کہیں یہ ہم سب کے لیے مصیبت نہ بن جائے۔''

بیوی کی یہ بات سن کر سیاہ گوش نے جواب دیا۔

''اے نیک بخت! وہ بھیڑیا گدھا تھا، اس بے وقوف کی سمجھ میں اتنا بھی نہ آیا کہ مٹی کا گھر بھی کہیں بولتا ہے، جو گیدڑ کو جواب دیتا۔ سیدھی سی بات تھی کہ وہ جس طرح چپ چاپ بیٹھا تھا، اسی طرح بیٹھا رہتا۔ گیدڑ دو چار بار اور آواز لگاتا جب کچھ جواب نہ پاتا تو اس کے دل سے گھر کے سامنے پیروں کے نشان کا وہم نکل جاتا اور بے دھڑک اپنے گھر میں گھس جاتا۔ تب بھیڑیا اس کو پکڑ لیتا اور اس کی ہڈیاں چبا جاتا۔''

ابھی سیاہ گوش اور اس کی بیوی میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک طرف سے شیر کے دہاڑنے کی آواز آئی۔ دل دہلا دینے والی شیر کی یہ آواز سن کر سیاہ گوش کی بیوی نے کہا۔

''میاں جی! اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، اچھا ہے کہ فوراً یہاں سے بھاگ چلیں۔ مفت جان دینے سے کیا حاصل؟''

''اے نیک بخت! تو بالکل خوف نہ کھا۔'' سیاہ گوش نے دلاسا دیتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس تو ایک کام کیجو! جس وقت شیر کی آواز بالکل گھر کے پاس آئے تو تو ان بچوں کو رلا دینا۔ پھر آگے میں سمجھ لوں گا۔'' پھر بیوی کے کان میں کچھ کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد شیر دہاڑتا ہوا اپنے گھر کے قریب آ پہنچا۔ سیاہ گوش کی بیوی نے اپنے میاں کی بتلائی ہوئی ترکیب پر عمل کرتے ہوئے بچوں کو رلا دیا۔ بچوں کے رونے کے بعد سیاہ گوش بولا۔

''اے نیک بخت! یہ بچے آج بے وقت کیوں رو رہے ہیں؟''

سیاہ گوش کی بیوی نے جواب دیا۔

''ان کم بختوں کو تو نے شیر کے گوشت کی جو چاٹ لگا دی ہے، سو یہ شیر کی بو سونگھ کر اپنی من پسند غذا مانگ رہے ہیں۔ ویسے تو کل ہی تو ہاتھی گینڈوں کو شکار کر کے لایا تھا جن کا ڈھیر سارا گوشت گھر میں رکھا ہوا ہے، مگر شیر کا گوشت کھائے بغیر ان کی بھوک ہی نہیں مٹتی۔''

یہ بات سن کر سیاہ گوش نے کہا۔

''یہ کون سی مشکل بات ہے۔ ان کو دلاسا دے، خدا سب کو رزق پہنچاتا ہے۔ مثل مشہور ہے:

خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔

یعنی خدا نے ان کی دل پسند غذا بھیج دی ہے۔ بس پل بھر میں شیر کا تازہ تازہ گوشت لا کر انھیں کھلاتا ہوں۔''

جنگل کے مہاراج ادھیراج میاں شیر نے جو یہ بات سنی تو مارے ڈر کے سہم گئے، اور دل میں سوچنے لگے۔

''یہ تو کوئی بہت خطرناک بلا معلوم ہوتی ہے۔''

اس خیال کا آنا تھا کہ شیر ناک کی سیدھ میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے گھر کے رکھوالے بندر نے جو یہ انہونی بات دیکھی تو وہ بھی شیر کے پیچھے پیچھے بھاگتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔

''اے مہاراج! ٹھہرو تو! ذرا میری بات تو سنو! اس قدر بے حواس ہو کر کیوں بھاگے جا رہے ہو۔'' مگر شیر نے ایک نہ سنی اور بھاگا ہی چلا گیا۔ بندر بھی اس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ اس نے پھر آواز دی۔

''ارے بھائی! ذرا رک جاؤ! اور میری بات سن لو۔''

شیر دم بھر کے لیے رُک گیا۔ تب بندر نے کہا۔

''ایک بالشت بھر کمزور جانور سے جنگل کے راجہ کو یوں ڈرنا نہیں چاہیے۔ کہیں ہاتھی بھی چیونٹی سے ڈرتا ہے۔ تم شیر ہو کر ایک کمزور سیاہ گوش کے ڈر سے بھاگ رہے ہو۔''

بندر کی یہ باتیں سن کر شیر کی کچھ ہمت بندھی، اور وہ اپنے گھر کی طرف لوٹا۔ سیاہ گوش نے جو دیکھا کہ دشمن نے پھر ادھر کو منہ پھیرا تو اپنی بیوی سے کہا۔

''ذرا بچوں کو پھر اسی طرح رلا دینا، پھر دیکھ اللہ کی قدرت کا کیا تماشا نظر آتا ہے۔''

سیاہ گوش کی بیوی نے شیر کے نزدیک آتے ہی بچوں کو پھر رلا دیا۔ سیاہ گوش نے بچوں کے رونے کی آواز سن کر کہا۔

''اے بی بی! تو آخر بچوں کو تسلی کیوں نہیں دیتی۔ اتنا کیوں گھبراتے ہیں۔ شیر میرے چنگل سے بچ کر جا کہاں سکتا ہے۔ یہ بندر مچھندر میرا بڑا پرانا اور وفادار یار ہے۔ ابھی دیکھنا کہ بھاگے ہوئے شیر کو کس ہوشیاری اور مکاری سے بہلا پھسلا کر واپس لاتا ہے۔ بس ذرا میرے سامنے آنے دے، پھر دیکھتا ہوں کہاں بچ کے جائے گا۔ اللہ نے چاہا تو پل بھر ہی میں اس کا تازہ گوشت لا کر ان کو کھلاتا ہوں۔''

اب جو شیر نے یہ بات سنی تو کہا۔

''کیا خوب! دشمن کہاں؟ بغل میں۔ یہ مکار بندر مچھندر اسی واسطے مجھے سمجھا کر لایا ہے کہ میں تو مارا جاؤں اور خود بچار ہے۔'' یہ کہہ کر شیر نے ایک زوردار تھپڑ بندر کے ایسا جڑا کہ اس کی جان ہی نکل گئی، پھر ایسا سرپٹ بھاگا کہ میلوں اور کوسوں پلٹ کر نہیں دیکھا۔

❑❑❑

بونگی کا پنچ تنتر (پانچ حصوں میں)

مصنف: گلزار

''پنچ تنتر'' کو ہندستانی ادبیات میں بے حد اہم مقام حاصل ہے۔ اس کی کہانیاں دلنشیں ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہیں۔ جناب گلزار نے اس کتاب میں بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کہانیوں کی زبان بالکل سادہ اور عام فہم رکھی ہے تاکہ بچے انھیں دلچسپی سے پڑھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہوسکیں۔

صفحات: 120، قیمت مکمل سیٹ: -/150 روپے

بونگی کے پتان چاچا

مصنف: گلزار

گلزار کے قلم سے بے حد آسان اور عام فہم زبان میں بچوں کے لیے ایک ایسی کہانی جس سے باتوں باتوں میں کافی معلومات بھی حاصل ہوجاتی ہیں۔

صفحات: 68، قیمت: -/55 روپے

بھیڑیا

مصنف: اے. کے. شری کمار / مترجم: تسکین زیدی

شکار کی کہانیاں دلچسپ بھی ہوتی ہیں اور معلوماتی بھی۔ ''بھیڑیا'' بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں بڑے دلچسپ انداز میں بھیڑیوں کے شکار کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس شکار کے دوران دو انسانی بچے بھی بھیڑیوں کا ساتھ دیتے ہوئے ملے۔ یہ کون تھے، یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کیجیے۔

صفحات: 104، قیمت: -/28 روپے

چیتوں کے دیس میں حیرت انگیز کارنامہ

مصنف: شیلجہ موہن / مترجم: محمد علیم

جنگلی جانوروں کا شکار جتنا دلچسپ ہوتا ہے اتنا ہی خطرناک بھی۔ بچوں کو ایسی کہانیاں بہت پسند ہوتی ہیں جن میں شکار کے دلچسپ واقعات بیان کیے گئے ہوں۔ ''چیتوں کے دیس میں حیرت انگیز کارنامہ'' ایسی ہی ایک کتاب ہے۔

صفحات: 69، قیمت: -/22 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

कौमी काउन्सिल बराए–फ़रोग़–ए–उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Human Resource Development, (Deptt. of Secondary and Higher Education), Govt. of India
West Block-1, Wing No-6, R.K. Puram, New Delhi-110066.
Tel: 011-26103938, 26103381, 26179657 Fax: 011-26108159 E-mail: urducoun@ndf.vsnl.net.in

اردو زبان میں ڈپلوما کورس

فاصلاتی نظامِ تعلیم کے تحت اردو زبان میں ایک سالہ ڈپلوما کورس (06-2005)
بذریعہ انگریزی اور ہندی 15/ جولائی 2005 سے شروع کیا جارہا ھے۔

اس کورس میں داخلے کے لیے داخلہ فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ 30جون 2005 ھے۔

کورس کا خاکہ:

(1) انگریزی یا ہندی کے ذریعے اردو رسمِ خط سکھانا

(2) قواعد اور Comprehension کا مختصر تعارف

(3) اردو نثر و نظم کا مختصر تعارف۔

یہ کورس دو طریقے سے چلایا جارہا ہے، اوّل اردو اسٹڈی سینٹروں کے ذریعے اور دوم براہِ راست قومی اردو کونسل کے ذریعے۔

کنٹیکٹ کلاسیں: سیکھنے والوں کی آسانی کے لیے اسٹڈی سینٹر میں کنٹیکٹ کلاسیں منعقد کی جائیں گی۔

اہلیت: انگریزی اور ہندی جاننے والے افراد اس کورس میں داخلے کے اہل ہیں۔ عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔

فیس: اردو اسٹڈی سینٹر کے ذریعے ڈپلوما کورس میں داخلے کے خواہش مند افراد کو کورس کی مکمل فیس 160 روپئے (بشمول دستور العمل اور داخلہ فارم) متعلقہ سینٹر میں رجسٹریشن کے وقت جمع کرنی ہوگی۔ کورس کا مواد مفت فراہم کیا جائے گا۔

جو طلبہ قومی اردو کونسل کے ذریعے براہِ راست اردو ڈپلوما کورس کرنا چاہتے ھیں وہ 300 روپئے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ، این.سی.پی.یو.ایل.، نئی دھلی کے نام سے بھیج کر براہ راست رجسٹریشن کرا سکتے ھیں۔

دستور العمل (Prospectus) اور داخلہ فارم کے لیے متعلقہ ریاست کے مراکز یا قومی اردو کونسل سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

RNI NO. 70323/99

DL-15052/2003-5

URDU DUNIYA Monthly, July 2005, Vol. 7, Issue:7

Date of Publication: 24/06/200

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

قومی اردو کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ اور بچوں کا ادبی ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کی ذہنی تربیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔ ان کتابوں سے بچوں کی تفریح بھی ہوتی ہے اور ان کی معلومات میں اضافہ بھی۔ کتابوں میں دی گئی خوبصورت تصاویر بچوں کو بے حد پسند آئیں گی۔

خواب مشین

مصنفین: سمر گھوش، رچا بنسل

مترجم: اقبال مہدی

ایک سائنس داں نے ایک ایسی مشین تیار کی تھی جس کی مدد سے کسی بھی انسان کے خواب کو کمپیوٹر اسکرین پر دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کا نام "خواب مشین" رکھا۔ ایک دوسرا سائنس داں خواب مشین کا فارمولا چرانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ایک دن اسے موقع بھی مل گیا۔ پھر کیا ہوا یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کیجیے۔

صفحات: 108، قیمت -/24 روپے

ڈیوی ڈیلز کا نیا طالب علم

مصنف: میتھیو پانکٹ / مترجم: زاہدہ خاتون

سمر ایک غیر معمولی لڑکا تھا۔ اس نے ایک سال کی عمر سے پہلے بولنا شروع کر دیا اور چار سال کا ہوتے ہوتے بڑوں کی گفتگو میں اس طرح حصہ لینے لگا جیسے اٹھارہ بیس برس کا ہو۔ جب اسکول میں اس کا داخلہ کرایا گیا تو چند دن میں ہی ایک ایک جماعت میں ترقی کرتے ساتویں جماعت میں پہنچ گیا۔ سمر کی یہ غیر معمولی ذہانت ہی اس کے لیے وبال جان بن گئی اور اس کے ساتھ مختلف قسم کے واقعات پیش آئے۔ تفصیل جاننے کے لیے پوری کتاب پڑھیں۔

صفحات: 135، قیمت -/30 روپے

مشک چور شکاری

مصنف: سرن کور / مترجم: سید پرویز

روشنی اور راجا کو ہرنوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ایک دن انھوں نے جنگل میں دیکھا کہ چار ہرن مرے پڑے ہیں اور ان کے پاس کچھ اجنبی لوگ کھڑے ہیں۔ [illegible] انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب کسی ہرن کا شکار نہیں ہونے دیں گے لیکن اس کے لیے انھیں شکاریوں کے سردار سے دشمنی مول لینی پڑی۔ کیا یہ بچے اپنی مہم میں کامیاب ہو سکے یہ جاننے کے لیے ناول کا مطالعہ ضروری ہے۔

صفحات: 80، قیمت: -/19 روپے

اسمیک

مصنف: اروپ کمار دتا / مترجم: شہناز فاطمہ

وہ ایک غریب لڑکا تھا جو اپنی ماں اور بیمار بہن کا پیٹ پالنے کے لیے ایک ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ اتفاق سے اس کا سابقہ نشیلی دواؤں کا دھندا کرنے والے گروہ سے پڑ گیا۔ [illegible] نے یہ ساری بات پولیس کے اعلیٰ افسران کو بتائی اور اس طرح اس گروہ کو پکڑنے کے لیے ایک مہم شروع ہوئی۔ ایک بے حد دلچسپ ناول جو بچوں کو ضرور پسند آئے گا۔

صفحات: 127، قیمت: -/28 روپے

مینلو پارک کا جادوگر

مرتبین: ایس۔ سی۔ بھٹاچاریہ، اے۔ کے۔ چکر برتی

مترجم: سید منصور آغا

انسانی تہذیب کی تاریخ دراصل سائنسی ترقی کی تاریخ ہے۔ جن بڑے لوگوں نے اپنی انتھک محنت سے ہمیں اتنی ساری آسانیاں فراہم کیں ان میں خاص ایڈیسن کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ایڈیسن کی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی ایجادات سے بھی واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 104، قیمت: -/23 روپے

راجدھانی میں ایک مہم

مصنفہ: دیپا اگروال، مترجم: صغرا مہدی

گرمی کی چھٹیوں میں بچوں کو تفریح اور سیر سپاٹے کا خوب موقع ملتا ہے۔ شمع، اسامہ، روشن اور ہلدر نے بھی ایسا ہی ایک پروگرام بنایا لیکن اسی دوران ان کی مڈبھیڑ اغوا کاروں سے ہو گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کیجیے۔

صفحات: 120، قیمت: -/26 روپے

بیرت پور کی سرگرمیاں

مصنف: مترا پھوکن / مترجم: سید ظفر الاسلام

[illegible] گرمی کی چھٹیوں میں بیرت پور کا جنگل دیکھنے کا منصوبہ بنایا اور [illegible] جنگلی جانوروں اور پرندوں کے علاوہ [illegible] بچوں نے ان کا تعاقب کیا [illegible] ایک دلچسپ مہماتی ناول جس میں قدم قدم پر تجسس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

صفحات: 167، قیمت -/35 روپے

منیشا کی رفاقت کے لیے

مصنف: دیویکا رنگاچاری، مترجم: شمیم بیگم

منیشا ایک تنہائی پسند لڑکی تھی جسے ماں باپ کے لاڈ پیار نے ضدی اور بدمزاج بنا دیا تھا۔ اس کے پاپا کے دوست کی بیٹی گھومنے کے لیے اس کے یہاں رہنے آئی۔ منیشا کو شروع شروع میں اس کا آنا گوارا نہ ہوا لیکن دھیرے دھیرے اس نے اس کے دل میں اپنی جگہ بنا لی اور منیشا کی بری عادتیں بھی چھڑا دیں۔ یہ کیسے ممکن ہوا یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات: 133، قیمت: -/30 روپے

نوٹ: طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066. Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel : 26103381, 26103938.